علامہ سید سلیمان ندویؒ

کی علمی وادبی خدمات

(سیمینار کے مقالات)

طلحہ نعمت ندوی

علامہ سید سلیمان ندوی اکیڈمی استھانواں بہار شریف

فہرست مضامین

عرض مرتب

پیش نظر مجموعہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کی ادبی خدمات کے عنوان سے منعقدہ سیمینار کے مقالات، مختلف اہل علم کے تاثرات اوراس سیمینار کی روداد پر مشتمل ہے جو ۳ر اپریل ۱۹۱۶ء کو سید صاحب کے شہر بہار شریف کے ٹاؤن ہال میں منعقد ہوا۔ جس کی صدارت سید صاحب کے فرزند ارجمند مولانا ڈاکٹر سید سلمان ندوی مدظلہ نے کی اور ممتاز اہل علم وقلم نے اس میں شرکت کی جن کا ذکر آئندہ اوراق میں ملے گا۔

حضرت سید صاحب پر یوں تو ملک میں دسیوں سیمینار ہو چکے ہیں لیکن خود ان کے شہر میں کوئی سیمینار نہیں ہوا تھا، اس ناحیہ سے یہ پہلا سیمینار تھا جو شہر بہار شریف میں منعقد ہوا۔

اس مجموعہ کے شرکائے مضامین چند وہ حضرات بھی ہیں جو خود سیمینار میں شریک نہیں ہو سکے تھے، کچھ نے مقالہ تیار کرلیا تھا لیکن ان کی شرکت نہ ہوسکی، کچھ صرف شریک مضمون ہیں۔ اکثر وبیشتر مضامین کا تعلق سید صاحب کی علمی خدمات ہی سے ہے، کچھ اس کے علاوہ بھی ہیں۔ پروفیسر احمد سجاد صاحب کے دو مضامین شامل مجموعہ ہیں، ایک انہوں نے دوسری نشست کے لئے لکھا تھا جس میں بہار شریف اوراس علاقہ کے رجال میں علامہ سید سلیمان ندوی کی عظمت کو اجاگر کیا تھا، لیکن وہ اسے سیمینار میں پیش نہ کر سکے، ان کا دوسرا مضمون یادرفتگاں کے تفصیلی تجزیہ اور تنقید پر مشتمل ہے اور بہت ہی اہم ہے، یادرفتگان پر اب تک اس نوعیت کا کوئی مضمون جو سید صاحب کی خاکہ نگاری کے تنقیدی تجزیہ پر مشتمل ہو راقم کی نظر سے نہیں گذرا اس لحاظ ایک ادیب وقت کے قلم سے نکلا ہوا یہ مضمون اپنی نوعیت کا شاید پہلا مضمون ہے۔ مولانا عمیر الصدیق ندوی نے سید صاحب ہی کی دو تحریروں کی روشنی میں ان کی شخصیت کے عناصر ترکیبی پر اپنے موثر انداز تحریر اور طرز ادا میں بہت ہی قابل قدر

مواد پیش کیا ہے ،ڈاکٹر سید ارشد اسلم صاحب نے اختصار کے ساتھ سید صاحب کی علمی خدمات کا جائزہ لیا ہے۔انہوں نے بعد میں یہ مضمون مزید اضافہ کے ساتھ اپنی نواشاعت کتاب ''فکر و آگہی'' میں شائع کر دیا ہے۔نیز انہوں نے ڈاکٹر سید سلمان ندوی مدظلہ سے ایک انٹرویو بھی لیا ہے جو اس سیمینار کے تاثرات پر مشتمل ہے وہ بھی اس کتاب میں شامل ہے۔مولانا سید راشد نسیم ندوی نے سید صاحب کے ادبی نظریات اور ان کے افکار و خیالات پر گفتگو کی ہے اور دیگر حوالوں کی روشنی میں ادب کی حقیقت پر بحث کرتے ہوئے سید صاحب کے مثبت نظریۂ ادب کو واضح کیا ہے۔نیز مولانا کا ایک تاثراتی مضمون بھی شامل کتاب ہے ،یوں بھی اس میں سیمینار مولانا کی عنایتیں رہیں وہ شکریہ سے بالاتر ہیں۔فاروق اعظم قاسمی صاحب نے نقوش سلیمانی کا تجزیہ کیا ہے اور خوب کیا ہے، گرچہ اس موضوع پر پہلے بھی کئی مضامین منظر عام پر آچکے ہیں لیکن اس مضمون کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ،وہ براہ راست سیمینار میں شریک نہ ہو سکے،اس کے بعد ان کا مقالہ ''اردو دنیا'' میں شائع ہوا ،اس مجموعہ میں وہ اسی سے ماخوذ ہے۔مولانا فرمان صاحب ندوی کا مقالہ سید صاحب کی عربی زبان کی خدمات پر ہے اور مولانا سید عبدالواحد ندوی کا مقالہ سید صاحب کی فارسی خدمات پر ہے اور اس ناحیہ سے بہت اہم ہے کہ اس موضوع پر شاید اب تک کوئی باضابطہ کام نہیں ہوا ہے۔اخیر میں راقم نے بھی اپنا ایک مقالہ سید صاحب کے تصور ادب پر شامل کیا ہے جو اجلاس میں پیش نہیں کیا جا سکا تھا،اس کے علاوہ خطبۂ استقبالیہ میں بھی اس موضوع پر کچھ عرض کیا گیا ہے۔نیز سید صاحب کی وہ نادر تقریر بھی اس میں شامل کی گئی ہے جو انہوں نے ترقی پسند تحریک کے اجلاس منعقدہ بھوپال میں فرمائی تھی، جو اب عام طور پر نگاہوں سے اوجھل ہے، اس سلسلہ میں ان کی شرکت کا ذکر ایک جگہ ملا اس کو بھی شامل کر لیا گیا ہے، تا کہ سید صاحب کے ادبی افکار و نظریات کو سمجھنے میں آسانی ہو، اور کچھ کتبات بھی ایسے آویزاں کئے گئے تھے جس میں سید صاحب کے نظریۂ ادب کی طرف اشارہ تھا نیز دوسرے بزرگوں کی تحریریں بھی

جس میں بہت سے مذہبی شہ پاروں اور علماء کی تحریروں کی ادبی معنویت کو اجاگر کیا گیا ہے، اور یہی بنیادی طور پر اس سیمینار کا مقصد تھا، جو ممکن ہے اس مجموعہ کے ذریعہ اہل علم تک پہنچ سکے۔ اخیر میں وہ تمام تصویریں جو سیمینار میں کتبات کی شکل میں آویزاں تھیں نیز سیمینار کی تصاویر، اور سید صاحب کے وطن اور باقیات اور کچھ یادگاروں کی تصاویر بھی اس میں شامل ہیں، تا کہ مضامین کے ساتھ یہ بھی محفوظ ہو کر قارئین کے لئے مفید ہو سکیں اور جو حضرات اس سیمینار میں شریک نہ ہو سکے اس کے ذریعہ ان کی کچھ تلافی ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ ہماری اس کوشش کو قبول فرما کر مفید بنائے۔

طلحہ نعمت ندوی

استھانواں بہار شریف نالندہ

شرکائے سیمینار

۱۔حضرت مولانا ڈاکٹر سید سلمان ندوی مدظلہ

سابق صدر شعبۂ اسلامیات ڈربن یونیورسٹی جنوبی افریقہ

۲۔مولانا عمیر الصدیق ندوی

مدیر معارف و رفیق دار المصنفین اعظم گڈھ

۳۔مولانا ڈاکٹر سید راشد نسیم ندوی

صدر شعبۂ عربی سیفل (انگلش اینڈ فارن لینگویجز) یونیورسٹی، حیدرآباد

۴۔مولانا پروفیسر حسان ندوی

صدر شعبۂ عربی برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال

۵۔پروفیسر احمد سجاد

مشہور ادیب و سابق صدر شعبۂ اردو رانچی یونیورسٹی

۶۔مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی سابق پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ

۷۔مولانا طلحہ ابو سلمہ ندوی

سابق استاذ علوم شرعیہ مدرسہ عالیہ کلکتہ

۸۔مولانا ڈاکٹر شاہ تقی الدین فردوسی ندوی (شریک مقالہ)

سابق استاذ عربی زبان و ادب وزارت تعلیم سعودی عرب حال مقیم پٹنہ

۹۔ڈاکٹر سید ارشد اسلم

پروفیسر شعبۂ اردو رانچی یونیورسٹی

۱۰۔مولانا ڈاکٹر سید عبد الواحد ندوی

لکچرار شعبۂ عربی صغریٰ کالج بہار شریف

رپورٹ سیمینار

تقریباً دس بجے شہر کے ٹاؤن ہال (واقع رانچی روڈ بہار شریف) میں سیمینار کا آغاز ہوا، نظامت کے لئے مولانا سید راشد نسیم ندوی (صدر شعبۂ عربی افلو حیدرآباد جن کا آبائی وطن استھانواں ہے اور سید صاحب کے قریبی عزیزوں میں ہیں) سے گزارش کی گئی جسے قبول فرما کر مولانا اسٹیج پر تشریف لائے اور تلاوت کلام اللہ سے اجلاس کے باقاعدہ آغاز کے لئے جناب قاری شارق صاحب استاذ مدرسہ اشاعت العلوم بہار شریف کو آواز دی، تلاوت کلام پاک کے بعد مولانا فہیم الدین ندوی مہتمم مدرسہ الصفا اورنگ آباد بہار نے شان رسالت میں گلہائے عقیدت پیش کئے، دریں اثناء حضرت صدر اجلاس اور معزز اہل علم مقالہ نگاران کی آمد ناز سے جلسہ کی رونق دوبالا ہوگئی، اور اب باقاعدہ اس باوقار تقریب کا آغاز ہوا۔ خطبہ استقبالیہ کے لئے صدر مجلس استقبالیہ مولانا سید عبدالواحد ندوی لکچرار شعبۂ عربی صغری کالج بہار شریف اسٹیج پر تشریف لائے، مولانا سے بہت تاخیر سے مجلس استقبالیہ کی صدارت کی گزارش کی گئی تھی لیکن اس کے باوجود مولانا نے اسے قبول فرما کر ممنون فرمایا۔ خطبۂ استقبالیہ کے اہم مباحث (جس میں بہار شریف ومضافات کی تاریخ کے علاوہ ندوۃ العلماء سے اس قدیم تاریخی شہر اور اس سے متصل دو بستیوں استھانواں اور دیسنہ کے تعلقات کا ذکر تھا) راقم نے پہلے ہی تیار کر لیے تھے، لہذا دوبارہ خطبۂ استقبالیہ تحریر کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی، اور مولانا نے وہی خطبہ اپنی زبانی توضیحات کے ساتھ سامعین کی خدمت میں پیش کیا، اس پر مغز اور علمی خطبۂ استقبالیہ کے بعد حضرت صدر اجلاس کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا گیا، پھر مقالات وتاثرات کا آغاز ہوا، سب سے پہلے مقالہ نگار مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی سابق پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدی پٹنہ کو دعوت

دی گئی، انہوں نے اپنا قیمتی مقالہ ''علامہ سید سلیمان ندوی اور اردو شاعری'' کے عنوان سے پیش کیا، پھر بھوپال سے تشریف لائے ہوئے معزز مہمان مولانا پروفیسر حسان خان ندوی بھوپالی صدر شعبۂ عربی مولانا برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال نے اپنے تاثرات پیش کیے، انہوں نے اپنی گفتگو میں کہا کہ میرے والد مولانا عمران خان ندوی سابق مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء سید صاحب کے بہت ہی چہیتے اور محبوب شاگرد تھے، اس لئے سید صاحب کا ذکر آغاز شعوری ہی سے سنتا رہا اور ان کی عقیدت ومحبت دل میں گھر کرتی گئی، یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آج ان کے دیار میں حاضری اور اس کے دیدار سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرنے کا موقعہ مل رہا ہے، یقیناً یہ موقع میرے لئے باعث مسرت وافتخار ہے، پھر انہوں نے سید صاحب کے کمالات واوصاف پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالتے ہوئے اپنی بات مکمل کی، اس کے بعد سید صاحب کی علمی یادگار دارالمصنفین اعظم گڑھ کے ترجمان اور وہاں کے علمی مجلّہ ''معارف'' کے مدیر مولانا عمیر الصدیق دریابادی نے مختصر تمہید کے بعد اپنا مقالہ پیش کیا ،انہوں نے حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ دسنہ اور استھاواں اور بہار شریف دیکھنے کی میری دیرینہ تمنا آج پوری ہو رہی ہے ،ہم بچپن سے اس دیار اور یہاں کے بزرگوں کا ذکر سنتے چلے آرہے ہیں، جس ادارہ سے مجھے وابستگی کا موقع ملا وہ یہاں کے بزرگوں اور اہل علم کی کوششوں کا ثمرہ ہے، پھر سید صباح الدین صاحب کا خاص طور پر ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ وہ میرے محسن ہیں جن کے ساتھ مجھے ایک مدت تک رہنے اور ان سے استفادہ کا موقع ملا ہے، پھر حضرت سید صاحب کی شخصیت پر انہوں نے اپنا مقالہ پیش کیا۔ان کے بعد ممتاز صاحب قلم اور اردو کے مشہور ادیب جناب پروفیسر احمد سجاد صاحب اسٹیج پر تشریف لائے ،ان کا وطن یہی شہر بہار شریف ہے اور رانچی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں تدریسی خدمت کا طویل دور گزارنے کے بعد اب مستقل وہیں مقیم ہیں اور کبھی کبھی اپنے شہر بہار شریف تشریف لاتے اور یہاں کی علمی مجلسوں کی زینت بنتے رہتے ہیں، اس اجلاس کے لئے بھی ان سے گزارش کی گئی جس کو انہوں نے قبول فرما کر ممنون فرمایا اور سید

صاحب کے ادبی شاہکار ''یادرفتگاں'' کے تنقیدی تجزیہ وتبصرہ اوراس کتاب کے حوالہ سے سید صاحب کی خاکہ نگاری کی خصوصیات پراپنا گراں قدر علمی مقالہ نذرسامعین کیا جواب اس مجموعہ کے ذریعہ نذر قارئین ہے، ان کے بعد پروفیسر ڈاکٹر سیدارشد اسلم صاحب شعبۂ اردو رانچی یونیورسٹی نے (جو سید صاحب کے بہت قریبی عزیزاورڈاکٹر سید سلمان ندوی مدظلہ کے ماموں زاد بھائی ہیں)سید صاحب کی علمی خدمات پراپنا مختصر مقالہ پیش کیا،سید صاحب کے حوالہ سے ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، نیز اسی موضوع پر کئی کتابیں زیر تحریراورزیر تجویز ہیں، اس موضوع پرآپ کی زیرنگرانی شعبۂ اردورانچی یونیورسٹی میں متعدد تحقیقی مقالات بھی لکھے گئے ہیں، اس ناحیہ سے ہم انہیں ماہرین سلیمانیات میں شمار کرسکتے ہیں۔ان کے بعد مولانا طلحہ ابوسلمہ صاحب ندوی سابق استاذ مدرسہ عالیہ کلکتہ نے سید صاحب کی شخصیت پر اپنا مقالہ پیش کیا، مولانا موصوف بھی اسی شہر بہارشریف کے باشندے ہیں، ان کے والد مولاناابوسلمہ شفیع محلّہ سکونت بہارشریف کے تھے، اس شہر میں ایک مدت تک مقیم رہ کر مدرسہ قومیہ کی تدریس کے علاوہ اپنے گھر میں مکتبہ علم وحکمت قائم کرکے اس سے حضرت سید صاحب کے مقالات کا سب سے پہلا مجموعہ ''مضامین سلیمانی'' کے نام سے شائع کیا نیز علم حدیث کی چند کتابیں بھی اپنی تحقیق سے شائع کیں، پھر مدرسہ عالیہ کلکتہ میں تدریسی خدمت کی بنا پر مستقل کلکتہ منتقل ہوگئے اور وہیں اپنے ادارہ کے ذریعہ علمی خدمات انجام دیتے رہے، ان کے بہارشریف کے دورقیام میں حضرت سید صاحب کی اپنے وطن کا آمدورفت کا سلسلہ جاری تھا، جب بھی حضرت سید صاحب وطن تشریف فرماہوتے تو مولانا سید صاحب سے استفادہ کے لئے دسنہ ضرورجاتے اورکئی دن قیام کرکے سید صاحب سے استفادہ کرتے رہے، اس لئے بہت سے حضرات نے ان کو ندوی الفکر کا اعزازی لقب بھی دیا، ان کے بلند پایہ علمی مضامین زیادہ تر برہان اور معارف میں شائع ہوئے ہیں۔

مولانا طلحہ ابوسلمہ ندوی کے بعد اورجن دیگر حضرات نے اپنے مقالات تیار کئے تھے لیکن کسی مجبوری کی بنا پر حاضری نہ ہوسکے اوراپنے مقالات ارسال کردئے تھے ان کے

مقالات پیش کرنے کا ارادہ تھا لیکن وقت کی تنگی کی بنا پر ان میں سے صرف ایک مقالہ پیش کیا جا سکا، ڈاکٹر شاہ تقی الدین فردوسی ندوی حفظہ اللہ جو اپنے حجاز کے طویل قیام اور تدریسی خدمات کے بعد اب پٹنہ میں مقیم ہیں ان سے عربی میں مقالہ کے لئے گزارش کی گئی تھی اور شاہ صاحب نے حضرت سید صاحب کی شخصیت پر ایک مفصل عربی مقالہ "عبقریۃ العلامۃ السید سلیمان الندوی" کے عنوان سے تیار کرلیا تھا لیکن اپنے اعذار کی وجہ سے شریک سیمینار نہ ہو سکے تو اپنا مقالہ عنایت فرمایا، راقم نے اس کا مفصل تعارف کراتے ہوئے اس کے جستہ جستہ اقتباسات حاضرین کے سامنے پیش کئے۔ صدر مجلس کی گفتگو سے پہلے بہار شریف کے سابق ایم ایل اے سید نوشاد النبی دسنوی نے اپنی مختصر گفتگو میں حضرت سید صاحب اور ان کے وطن کا ذکر کیا، وہ حضرت سید صاحب اور ان کے ایک ہم عمر رفیق وطن کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ پھر ناظم جلسہ جناب مولانا سید راشد نسیم ندوی نے سامعین سے خطاب کرتے ہوئے عصر حاضر میں امت مسلمہ کے حالات اور مختلف ممالک کی سیاحت سے انہیں جو تجربات حاصل ہوئے ان کی طرف رہنمائی کی اور اپنی مختصر گفتگو کے بعد حضرت میر کارواں سے خطاب کی گزارش کی، مجمع ہمہ تن گوش ہوگیا، صدر مجلس نے یہ شعر پڑھا

سجدہ طلب ہے راہ کا ہر ذرہ اے جگر
کیا ہم حدود کوچۂ جاناں میں آ گئے

اور یہ شعر بھی جو ان کے والد ماجد علیہ الرحمہ نے ندوہ سے طویل جدائی کے بعد وہاں کے اسٹیج پر قدم رکھتے ہوئے پڑھا تھا۔

میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو ۔۔۔ میں اپنے آپ کو مانند مہماں لے کے آیا ہوں

اس کے بعد فرمایا کہ اس شہر میں ۱۹۵۰ء کے بعد میری پہلی حاضری ہے، بچپن میں اپنے وطن جاتا تو ان ہی راہوں سے گزر کر جاتا تھا، یہی دسنہ اور استھانواں ہیں جہاں سے میری بچپن کی یادیں وابستہ ہیں، اس کے بعد حضرت سید صاحب کے اقوال و ارشادات اور خصوصیات پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور اخیر میں ان کی روحانی زندگی کی طرف

اشارہ کرتے ہوئے حاضرین کو یہ پیغام دیا کہ

نقش ہیں سب نا تمام خون جگر کے بغیر
عشق ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

سید صاحب کی آخری زندگی کا پیغام یہی ہے، اور یہی اس سیمینار سے جو اس عظیم شخصیت پر ہو رہا ہے ہمیں سبق ملتا ہے۔

یہاں یہ کہہ دینا بھی بے محل نہیں کہ حضرت سید صاحب کے مرکزی شہر میں ان کی شخصیت پر سیمینار منعقد کیا گیا، جس میں خود ان کے فرزند ارجمند کے علاوہ ملک کے معزز اہل علم نے شرکت کی لیکن شہر کے عوام الناس کیا اہل علم کی طرف سے بھی ان مہمانوں کا وہ استقبال نہیں ہوا جو ان عظیم مہمانوں اور بالخصوص ڈاکٹر صاحب جیسے عظیم المرتبت مہمان کا ہونا چاہیے تھا، اور جو اس شخصیت کے شایان ہو۔ سید صاحب کی شخصیت ہی کیا کم تھی کہ اس پر مستزاد ان کے فرزند ارجمند کی آمد جو اس وقت عالم اسلام کے ممتاز عالم ہیں۔ جب کہ منتظمین سیمینار کی طرف سے اطلاع و اعلان میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا، تقریباً شہر کے تمام اہل علم کو دعوت نامے ارسال کیے گئے، اس کے علاوہ کئی بار اخباروں میں بھی اعلان شائع ہوا، لیکن جب یہ اہل علم یہاں سے رخصت ہوئے تو یہ تاثر لے کر کہ شاید یہ علمی و تاریخی شہر اب اپنے باشندوں کی بدذوقی پر ماتم کناں ہے اور اس کے دل میں اپنے نامور سپوتوں کی کوئی قدر نہیں۔

مکتوب مشتمل بر تأثرات

از جناب مولانا ڈاکٹر سید سلمان ندوی

برادم محمد ضیاء الحق صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا عنایت نامہ ملا، یاد فرمائی کا بہت شکریہ

میں تو آپ حضرات کا بہت ممنون ہوں اور خصوصا طلحہ نعمت صاحب کا کہ آپ حضرات کے اصرار نے مجھے اس سرزمین کو دکھلایا جو ہم ۱۹۵۰ء میں چھوڑ چکے تھے، کاش موقع ملتا تو دسنہ اور استھانواں بھی دیکھ سکتا، میرا پروگرام پٹنہ کا بڑا لگا بندھا تھا اس لئے موقع نہیں ملا، پورے پروگرام کی مکمل اطلاع بھی نہیں تھی، آئندہ ان شاء اللہ موقع ملے گا بہ شرط حیات۔

میں تو بہت ممنون ہوں کہ آپ نے اور آپ کے رفقاء نے بہت اچھی تقریب منعقد کرلی اور مجھے اس میں شرکت کی سعادت ملی، فجزاکم اللہ خیراً۔

طلحہ نعمت اور دوسرے رفقاء کو سلام

والسلام

سید سلمان ندوی

تأثراتِ سیمینار

مولانا پروفیسر سید راشد نسیم ندوی

۳/اپریل ۲۰۱۶ء کی صبح بہار شریف کے قدیم تاریخی شہر کے افق پر اسکالرس و محققین کی ایک کہکشاں نمایاں ہوئی تھی، جو علامہ سید سلیمان ندویؒ کی ادبی خدمات کو اخراجِ تحسین پیش کرنے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ یہ دراصل ایک سیمینار کا موقع تھا جو علامہ سید سلیمان ندویؒ کی ادبی خدمات کے عنوان پر بہار شریف کے ٹاؤن ہال میں منعقد ہوا اور اس کا انتظام وانصرام یونائیٹڈ ویلفیر ایسوسی ایشن استھانواں نے عمدہ واعلیٰ معیار پر انجام دیا، سیمینار کے روحِ رواں جناب مولانا طلحہ نعمت ندوی استاذ جامعہ سید احمد شہیدؒ لکھنؤ تھے اور جناب ضیاء الحق شرفی صدر ایسوسی ایشن تھے، جبکہ صدارت مولانا پروفیسر ڈاکٹر سید سلمان ندوی، سابق ڈین وصدر شعبہ اسلامیات، ڈربن یونیورسٹی، ساؤتھ افریقہ نے فرمائی جو اس منصب کا علمی ونسبی استحقاق رکھتے ہیں، مولانا سید عبد الواحد ندوی فرزند مولانا سید نظام الدین صاحب مرحوم سابق معتمد عمومی مسلم پرسنل لا نے خطبۂ استقبالیہ میں دریا کو کوزے میں سمیٹتے ہوئے بہار شریف کی علمی تاریخ، مسلم دانشوروں کی خدمات اور علامہ سید سلیمان ندویؒ کے امتیازات کا تذکرہ کیا۔ مقالہ نگاروں میں پروفیسر حسان خان ندوی بھوپال، پروفیسر احمد سجاد رانچی، پروفیسر ارشد اسلم رانچی یونیورسٹی، مولانا عمیر الصدیق دریابادی ندوی دار المصنفین اعظم گڑھ کے علاوہ راقم السطور شامل تھا، ان علمی وادبی مقالات میں علامہ سلیمان ندوی کے ادبی کارناموں کے علاوہ اسلوب نگارش اور ادبی نظریات پر اظہار خیال کیا گیا، اجلاس کے صدر محترم پروفیسر سلمان صاحب ندوی نے اپنے خطاب میں جہاں نصف صدی کے بعد اس علاقے میں اپنی آمد کے موقع پر کتاب

زندگی کے چند اوراق کو کھولا وہیں علامہ ممدوح کے ادبی موقف، علمی شغف اور تالیفی سرمایہ پر بھی گفتگو فرمائی، نیز اس مجلس کے جوش وخروش اور نوجوان کی شرکت کو مدنظر رکھتے ہوئے، آپ نے نئی نسلوں کو کتب بینی کا مشورہ دیتے ہوئے فرمایا کہ کوئی بھی جدید ایجاد کتب کا بدل نہیں جو ہمارے اسلاف کا بیش بہا سرمایۂ میراث ہے، سمینار کے انعقاد میں عزیزم مولانا طلحہ نعمت ندوی اور ضیاء الحق شرفی نے اپنے ساتھیوں کی ٹیم کے ساتھ جو بے لوث محنت کی اس کے مثبت نقوش دل ودماغ پر نہ صرف پیوست ہوگئے بلکہ مستقبل میں ان کی مستعد ٹیم سے بڑی امیدیں وابستہ ہوگئی ہیں کہ تیز وتند ہواؤں میں اپنے دیئے روشن رکھنا ہی سیمابی نوجواں کی صفت ہے، اللہ تعالی کے ذات سے پوری امید ہے کہ آئندہ بھی ایسے مثبت اور مفید پروگرام کے انعقاد کا حوصلہ وتوفیق عطا کرے گا، وما ذلك على الله بعزيز.

تلخیص خطبۂ صدارت

سجدہ طلب ہے راہ کا ہر ذرہ اے جگر
کیا ہم حدود کوچۂ جاناں میں آگئے؟؟

۱۹۵۰ء کے بعد یہ میری اپنے وطن میں پہلی حاضری ہے، بچپن میں جب استھانواں اور دیسنہ جانا ہوتا تو اسی بہار شریف کے راستہ سے گزر کر ہم لوگ اپنے وطن جاتے۔ میں بہت ہی ممنون ہوں مولانا راشد صاحب اور طلحہ صاحب کا کہ ان کی دعوت نے مجھے دوبارہ اس دیار کی طرف کھینچا۔ ان شاء اللہ کبھی فرصت ہم دست ہوئی تو اپنے وطن دیسنہ اور استھانواں بھی حاضری ہوگی۔ والد ماجد نے ندوہ کے آخری سفر کے موقع پر ایک شعر پڑھا تھا

میں اپنے گھر میں آیا ہوں مگر انداز تو دیکھو
میں اپنے آپ کو مانند مہماں لے کے آیا ہوں

اس وقت مجھ پر بھی یہی شعر صادق آرہا ہے۔ حضرت والد رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے وطن میں آکر جو راحت ملتی تھی وہ دوسری جگہ نصیب نہیں ہوتی تھی، وہ اپنے وطن میں خود کو سلو کہے جانے پر بہت خوش ہوتے، ان کی ایک پھوپھی انہیں سلو ہی کے نام سے یاد کرتی تھیں، وہ اپنے وطن میں بے تکلف رہتے۔ حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت ہشت پہل اور ان کی خدمات متنوع ہیں، ان کی ادبی خدمات تو صرف ان کی شخصیت کا ایک پہلو ہے، ضرورت ہے کہ دوسرے پہلوؤں پر بھی سیمینار ہو، یہ مقالات جو پڑھے گئے اگر شائع کردئے جائیں تو بہت مفید رہیں گے اور ان سے اصل استفادہ ہو سکے گا۔ اس اجلاس میں تفصیل سے ان کی کتاب یاد رفتگاں پر روشنی ڈالی گئی، یہ کتاب درحقیقت ان کے وسیع تعلقات کا آئینہ ہے،

جس میں تقریباً نصف صدی تک ان کے علمی تعلقات کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے، اس سے ان کی رواداری، وسعت نظری اور اسلام کے لئے ان کی غیرت کا اندازہ ہوگا۔ والد ماجد اپنے کمال کے آخری درجہ پر پہنچنے کے باوجود اپنے استاذ علامہ شبلی کو کبھی نہیں بھولے اور ان کے احسانات کو ہمیشہ یاد رکھا۔ اسی طرح اخیر میں اپنی روحانی تشنگی دور کرنے کے لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے آستانہ پر جھکے، اور اپنی عظیم المرتبت شخصیت کی بالکل پرواہ نہ کی، اس سے ان کی روحانی زندگی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، ان کی زندگی امام غزالی سے مشابہ نظر آتی ہے۔ اخیر میں انہوں نے رجوع واعتراف کے عنوان سے مضمون لکھ کر اپنی تمام غلطیوں سے علانیہ رجوع کیا، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ روحانی زندگی کی کیا اہمیت ہے۔ لہذا اپنی آخرت کو سنوارنے اور بنانے کی طرف بھی ہماری توجہ ہونی چاہئے، یہ ہمارا فریضۂ زندگی ہے، اس سے غفلت نہیں ہونی چاہئے، ان کی زندگی ہمارے لئے یہی سبق رکھتی ہے کہ ہم خود کو جھکا دیں اور اپنے آپ کو سنوارنے کی کوشش کریں۔ اس دور میں طلبہ کو تعلیم کی طرف متوجہ کرنا بھی بے حد ضروری ہے، ان کی صحیح تربیت اور صحیح اسلامی عقیدہ کے مطابق ان کی تعلیم کی طرف توجہ ہونی چاہئے، اس سلسلہ میں مولانا الیاس بھٹکلی صاحب نے جو کورس تیار کیا ہے وہ قابل توجہ ہے، ہمیں اسے طلباء کے نصاب میں شامل کرنا چاہئے، والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہاں یعنی پاکستان میں الحاد اور ہندوستان میں ارتداد پھیلے گا، لہذا نسل نو کے عقیدہ کی حفاظت کی طرف خصوصی توجہ ہونی چاہئے۔ نیز علم ومطالعہ کا خاص اہتمام ہو، جدید آلات قدیم کتابوں کا بدل کسی بھی طرح نہیں ہو سکتے، والد محترم کا یہی امتیاز ہے کہ انہوں نے پوری زندگی اپنے آپ کو علم کے لئے وقف کر دیا تھا، جو کام بھی ہو وہ اپنے بڑوں کی روشنی میں ہو، بوڑھوں کا مشورہ اور نوجوانوں کا عمل ساتھ رہے تو کام مکمل ہوتا ہے۔ اللہ ہم سب کو توفیق سے نوازے۔

خطبۂ استقبالیہ

نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم امّا بعد !

مخدوم ومکرم حضرت میر کارواں، مہمانانِ گرامی اور حاضرین مجلس!

اس تاریخی شہر اور ارباب فضل وکمال کی اس سرزمین پر جو اہل کمال کا منبع، اہل دل کی خلوت گاہ اور ارباب وفا کا مخزن ومدفن رہی ہے ہمیں اپنے معزز ومحترم مہمانوں کا جن میں علم وفضل کی مقتدر شخصیات اور گرامی قدر ہستیاں شامل ہیں خیر مقدم کرتے ہوئے بے حد مسرت اور بے پناہ خوشی ہو رہی ہے، اور ہمارے دل آپ تمام حضرات کے تئیں تشکر وامتنان کے جذبات سے لبریز ہیں کہ آپ نے دور دراز سے زحمت سفر برداشت کرتے ہوئے اس دور افتادہ شہر کو جو تمدنی سہولتوں سے بہت حد تک محروم ہے اپنی آمد باوقار سے زینت بخشی اور تمام مشغولیات پر ہماری حقیر عوت کو ترجیح دی اور اس سیمینار میں شرکت فرمائی جو اس شہر کے مضافات کی ایک مردم خیز وعلم پیز بستی دیسنہ کے ایک عظیم سپوت، ایک نامور شخصیت، اور نہ صرف ہم سب کے لیے، نہ صرف اس صوبہ کے لیے بلکہ پورے ملک کے لیے سرمایۂ فخر ہستی یعنی حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ادبی خدمات پر منعقد ہو رہا ہے۔

سامعین گرامی قدر!

صدیوں نہیں ہزاروں سال کی تاریخی عظمت کا امین یہ شہر بہار شریف اپنے جلو میں اقدار وروایات، تمدن وثقافت اور تہذیبی تنوعات کی ایک دنیا رکھتا ہے، اس کے سینہ میں مختلف مذاہب وادیان کے عروج وزوال کی دلچسپ داستانیں محفوظ ہیں، دنیا میں بہت کم ایسے خطے اور شہر ہوں گے جہاں ان کے عہد آغاز سے علم وفضل کا تسلسل قائم ہو، اور اس کا نام خود علم ومعرفت کا رمز ہو۔ ۷۵۰ عیسوی میں بنگال کے راجا گوپال نے اپنے مقبوضہ علاقہ میں اودانت

پوری نامی ایک بستی میں ایک بڑا وہیارہ یعنی دانش گاہ علم ومعرفت تعمیر کروائی اور بدھ مذہب کے حریف اس کی قدیم دانش گاہ نالندہ کے مقابلہ میں اس کے فروغ کی پوری کوشش کی، بالآخراس کے اخلاف نے اسی شہر کواپنا دارالحکومت بنالیا اوراس طرح رفتہ رفتہ مگدھ کے نام پر یہ نام غالب آیا، اوراس وہیارہ نے بہار بن کر مگدھ وتر ہٹ کوجلد ہی اپنے دامن میں سمیٹ لیا، ماقبل اسلام کی تاریخ ہماری ثقافت کا حصہ نہیں اس لیے ہم اس سے صرف نظر کرتے ہوئے دوراسلام کے آغاز کا تذکرہ کرتے ہیں، اس شہر کی تعمیر کے چارسو سال کے بعد بارہویں صدی عیسوی اور چھٹی صدی ہجری کے اواخر میں ترکستان کے جواں مرد کشور کشا اختیارالدین محمد بن بختیار خلجی نے اس شہر پر اپنی فتح کا علم بلند کیا، اوردارالحکومت کی حیثیت سے اپنی ساری توجہ اسی پر مبذول کی، اور بالآخر بنگال وتبت کی مہم سے واپس ہوکراسی سرزمین میں پیوندخاک ہوا، اس شہر کے ایک محلہ عماد پور میں اس کی قبر موجود ہے۔اسلام کے زیرنگیں آجانے کے بعد عہد سلطنت کے طویل دور میں بھی اس کی مرکزی حیثیت برقرار اور دارالحکومت کی حیثیت سے اس کی رونق قائم رہی، چناں چہ اس کی مرکزی حیثیت نے وقت کے ممتاز علماء وارباب کمال کواپنی طرف کھینچا، سلاطین وامراء اورشاہان دہلی بھی یہاں تشریف لاتے رہے، بنگال جاتے اور آتے ہوئے فیروزشاہ تغلق کا قیام شاید اس کی اسی مرکزی حیثیت کی بنا پر تھا، پھر شیر شاہ سوری جیسے ہندوستان کے نامور شہنشاہ نے اسی شہر میں اپنی نانہال میں نشوونما پائی، اوربعض روایت کے مطابق اسی کے مضافات کی ایک بستی کواس کا مولد بھی کہا جاتا ہے، اسی طرح ایک دوسری بستی جانا کی مسجد میں اس کے کئی مہینوں تک بحیثیت مؤذن قیام کی روایت بھی ذکر کی جاتی ہے، شیر شاہ سوری نے شاید سہولت کے پیش نظر صوبہ کا پایۂ تخت یہاں سے پٹنہ منتقل کردیا۔پھر جب اس ملک کی قیادت شہنشاہ اکبر کے حصہ میں آئی تواس نے بہار کوسات سرکاروں میں تقسیم کیا جس میں یہ شہر بھی شامل تھا۔

معزز حاضرین! یہ ساری تاریخی سیاسی داستان تسلسل واقعات کے پیش نظر ذکر کردی گئی، لیکن اس شہر کی حقیقی عظمت بیت المقدس میں ابوالانبیاء سیدنا ابراہیم علیہ السلام

کے مدفن شہر الخلیل سے ہجرت کر کے قصبہ منیر میں اقامت گزیں ہو کر اس خطہ کو نور ایمان سے منور کرنے والے ہاشمی خاندان کے اس عظیم و نامور سپوت یعنی حضرت مخدوم الملک شرف الدین احمد بن یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ کی رہین منت ہے جنہوں نے طویل ریاضات شاقہ اور راجگیر و بہیا کے خلوت کدوں میں اسرار معرفت کا محرم راز بن جانے کے بعد ارشاد و ہدایت کے لیے اس سرزمین کا انتخاب فرمایا اور اپنی شعلہ نفسی اور قوت باطنی سے پورے ملک کے مخدوم بن کر اس شہر کو شہرت و عزت اور عظمت و وقار کے خلعت دوام سے اس طرح سرفراز فرمایا کہ آج سات صدی کا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی اس شہر بہار کا نام "شریف" کے لاحقہ کے ساتھ بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔ حضرت مخدوم الملک کے بعد ان کے باکمال جانشینوں کا دریائے فیض اسی طرح جاری رہا، اور حضرت مظفر شمس بلخی، شیخ حسین نوشہ توحید بلخی، شیخ احمد لنگر دریا بلخی، مخدوم احمد چرم پوش جیسی عظیم المرتبت روحانی شخصیات بادۂ حقیقت و معرفت تقسیم کرتی رہیں، اور تشنگان معرفت آآ کر سیراب ہوتے رہے۔

سلسلۂ مخدومیہ کے علاوہ عہد مغلیہ میں بھی ہمیں متعدد باکمال ارباب علم و فضل نظر آتے ہیں جن کا آشیانہ اسی سرزمین کا ویرانہ تھا، اورنگ زیب عالمگیر کی تعلیم کے لیے ملا محی الدین عرف ملا موہن بہاری اسی شہر سے بلائے گئے تھے، اور عہد عالمگیری کے ممتاز عالم و قاضی اور اورنگ زیب کے جانشیں شاہ عالم کے عہد میں متحدہ ہندوستان بشمول افغانستان کے شیخ الاسلام قاضی محب اللہ بہاری کا مولد اسی شہر کا ایک مضافاتی قریہ کڑا ہے، اپنے وقت کے اس شیخ الاسلام نے اس دور کے سب سے بڑے اعزاز کے حصول کے بعد ابدی راحت کے لیے اپنے اسی آبائی وطن کو ترجیح اور وفات سے چند ماہ قبل وطن میں گوشہ گیر ہو کر یہیں وفات پائی، اور اسی شہر کے محلّہ چاند پورہ میں محو خواب ہیں، ان کی دو شہرۂ آفاق کتابوں سلم العلوم اور مسلم الثبوت نے پورے عالم اسلام کے نصاب کا حصّہ بن کر تقریباً سو سال تک مصر و شام اور ہندوستان کے علماء کی ذہنی جولان گاہ بنی رہیں۔ عہد اکبری کے نامور محدث اور حضرت شاہ عبدالحق دہلویؒ کے شاگرد رشید حضرت سید یٰسین گجراتی ثم سامانوی نے پنجاب و بنگال کے مختلف علاقوں اور اس

صوبہ کے مختلف شہروں کی رہ نوردی کے بعد یہیں رخت سفر کھولا اور ایک عرصہ تک ارشاد ومعرفت میں مشغول رہ کر یہیں بمقام خندق سپرد خاک ہوئے۔

سامعین! یہاں کے رجال وشخصیات کے مفصل تعارف کی نہ یہاں گنجائش ہے نہ موقع، نیز اس کے مضافات کی مردم خیز بستیاں خود ایک مستقل بحث وتحقیق کا موضوع ہیں، بس اتنا عرض کرنا ہے الحمدللہ ہمیں بیسویں صدی تک علم وفضل کا یہ سلسلہ پوری طرح جاری وساری نظر آتا ہے، اور حدیث نبوی خيارهم في الجاهلية خيارهم في الإسلام کے بموجب عہد ماقبل اسلام سے اب تک اس کی مردم خیزی برقرار ہے۔ چنانچہ بیسویں صدی کے نامور رجال میں مولانا سید سلیمان اشرف بہاری استاد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، حضرت شاہ امین ثبات فردوسی صاحب سجادہ بہار شریف، اور بہار کے محسن وکرم فرما حضرت مولانا ابوالمحاسن، محمد سجاد بہاری علیہ الرحمۃ (جن کا وطن گو یہاں سے قریب پنہسہ نامی ایک گاؤں ہے لیکن ان کا زیادہ وقت یہیں گزرا،) مولانا محمد حسن معصومی اور ان کے دو نامور فرزند، ڈاکٹر صغیر حسن معصومی رکن مجمع اللغۃ العربیہ دمشق وڈائرکٹر ادارہ ثقافت اسلامی کراچی اور دوسرے عظیم المرتبت فرزند، ممتاز محقق ومحدث وادیب اور عربی زبان کے رمز شناس مولانا ابومحفوظ الکریم معصومی، مولانا اصغر حسین بہاری اور ممتاز مصنف اور علم حدیث کے خادم مولانا ابوسلمہ شفیع بہاری کا نام دنیائے علم میں کسی طرح محتاج تعارف نہیں۔ شاید شاہ ولی اللہ دہلوی علیہ الرحمہ کا مشہور جملہ "بلدۂ بہار کہ مجمع علماء بود" اسی شہر کے لیے کہا گیا تھا۔

سامعین!

آج ہم جس شخصیت کی یاد میں یہاں یکجا ہوئے ہیں وہ جس ادارہ کی پروردہ، اس کی ترجمان، گل سرسید اور سید الطائفہ ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر سے اس ادارہ کی وابستگی کا بھی تذکرہ کردیا جائے۔ عظیم آباد اور اس کے مضافات کے شرفاء کا ندوۃ العلماء کی تحریک سے جو گہرا تعلق اور فکری لگاؤ رہا ہے وہ تاریخ کا ایک روشن باب ہے، لیکن مضافات عظیم آباد میں اس شہر اور اس سے متصل دور زخیر بستیوں استھانواں اور دیسنہ کی تحریک ندوۃ العلماء کی

تائیدوحمایت اوراس کے دور آغاز سے اس سے ذہنی وفکری وابستگی کی داستان یہاں کی علمی تاریخ کا ناقابل فراموش حصہ ہے، اس کے ابتدائی سرگرم ارکین میں یہاں کی کئی ممتاز شخصیتوں کے نام نظر آتے ہیں، ۹۸-۱۸۹۷ء میں ندوۃ العلماء کا ایک وفد جو ملک کے ممتاز علماء واہل علم پر مشتمل تھا مختلف شہروں کا دورہ کرتا ہوا عظیم آباد آیا تو اس نے اس شہر کو بھی اپنی حاضری کا شرف بخشا، اور یہاں محلہ میر داد میں خانقاہ مخدوم الملک کے زیب سجادہ حضرت شاہ امین فردوسی کی صدارت میں اس کا اجلاس منعقد ہوا، نیز ندوۃ العلماء کے سب سے پہلے اجلاس کانپور ۱۸۹۳ء میں جب کہ ندوۃ العلماء کی تحریک زیر تجویز تھی، دیگر بزرگوں کے ساتھ ہمیں مولانا سید تجمل حسین دسنوی رحمۃ اللہ علیہ کا نام نظر آتا ہے جو تا زندگی ندوۃ العلماء کی ترجمانی کی خدمت انجام دیتے رہے، دوسری طرف مولانا سید محمد احسن استھانوی، بانی ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد علی مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کے دست راست کی حیثیت سے اس تحریک میں سرگرم عمل تھے ۱۹۰۰ء میں جب عظیم آباد میں ندوۃ العلماء کا تاریخ ساز اجلاس منعقد ہوا تو اس میں بھی اس شہر اوران دونوں بستیوں کے شرفا بھی سرگرم عمل تھے، اس اجلاس کے ایک سرگرم رکن مولانا سید رحیم الدین استھانوی ایڈیٹر ہفتہ وار اخبار الپنچ بانکی پور نے اپنے اخبار کا ایک کالم تحریک ندوۃ العلماء کے آغاز ہی سے اس کی تائید وحمایت کے لیے خاص کر رکھا تھا اور اپنی زندگی تک یہ اخبار اس تحریک کی تائید وحمایت میں پوری طرح سرگرم رہا، عظیم آباد کے اجلاس کی کارروائی مولانا سید رحیم الدین ہی کے قلم کی یادگار ہے، ان کے برادر زادۂ عزیز مذکور الصدر مولانا محمد احسن استھانوی نے حضرت مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کی نگرانی میں تحفۂ محمدیہ نکالا، جس کے ہر شمارہ کے کچھ صفحات ندوۃ العلماء کے لئے ضرور وقف ہوتے جو بیشتر مولانا محمد احسن ہی کے قلم سے ہوتے، ندوۃ العلماء کے اجلاس سوم منعقدہ بریلی کی مفصل رپورٹ انہیں کے قلم کی یادگار ہے، افسوس کہ صرف تیس سال کی عمر پا کر عین عالم شباب میں انہوں نے اس دنیا کو الوداع کہا۔ ندوۃ العلماء کی تحریک اپنے دور آغاز سے جس طرح ان دونوں بستیوں میں مقبول ہوئی اور فکری وثقافتی ہر حیثیت سے اس نے ان دونوں بستیوں پر جو اثر ڈالا اس کا اندازہ اس سے کیا

جا سکتا ہے کہ یہاں کے تعلیم یافتہ افراد میں فضلائے ندوۃ العلماء کا تناسب کم از کم چالیس فی صدی ہوگا، مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کے بقول وہ جب اپنے زمانۂ طالب علمی میں ایک بار ندوۃ العلماء حاضر ہوئے تو دسنوی طلبہ کی تعداد اس وقت سترہ تک پہنچی ہوئی تھی، افسوس کہ تقسیم ہند کے اس ادارہ سے یہ تعلق باقی نہ رہ سکا۔ انہیں کے درمیان دسنہ سے اٹھنے والی امام الندویین، سید الطائفہ اور ندوۃ العلماء کے امین وترجمان کی وہ عظیم ہستی بھی ہے جن کی یاد میں آج ہم یہاں جمع ہیں، ایک ممتاز ندوی فاضل مولانا ڈاکٹر سید تقی الدین فردوسی ندوی کے بقول

بہار ہی میں ہے دسنہ کا وہ عظیم مقام　　　جہاں کی خاک سے اٹھے تھے ندویوں کے امام

حضرت سید صاحب کی شخصیت کے علاوہ دسنہ کے عظیم ممتاز ندوی فضلاء میں آپ کے برادر زادہ عزیز مؤرخ ہند مولانا سید ابوظفر ندوی، مولانا سید نجم الہدیٰ ندوی، مولانا سید عبدالباری ندویؒ، مولانا سید محمد قاسم ندوی بن مولانا سید تجمل حسین دسنویؒ، مولانا سید فخر الملک ندویؒ، مولانا سید عبدالحفیظ ندوی، نامور مصنف سید نجیب اشرف ندوی، پروفیسر سعید رضا ندوی سینٹ زیورس کالج بمبئی، ان کے فرزند عبدالحی رضا ندوی، سید عبدالسبحان ندوی، مولانا مصطفیٰ کریم ندوی پروفیسر متھلا یونیورسٹی دربھنگہ، اور استھانواں کے ممتاز ندوی فضلاء میں حضرت سید صاحب کے پھوپھی زاد بھائی مذکور الصدر مولانا سید محمد احسن استھانویؒ کے فرزند ممتاز عالم اور علم حدیث کے متعدد بلند پایہ کتابوں کے مرتب ومحقق مولانا سید ہاشم ندوی سابق ناظم دائرۃ المعارف حیدرآباد، مولانا سید عبدالغفور شر ندوی معاون ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید رحیم الدین استھانوی کے دو فرزند مولانا سید محمد ندوی ناظم مدرسہ محمدیہ استھانواں ومولانا سید احمد ندوی، مولانا سید افتخار احمد ندوی، عربی اور اُردو میں متعدد کتابوں کے مصنف مولانا حاجی معین الدین رفیق دار المصنفین وپرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ، مولانا محمد قاسم ندوی ناظم اول مدرسہ محمدیہ استھانواں، مولانا محمد اسحاق ندویؒ اور اس سلسلہ کی آخری کڑی مولانا ڈاکٹر سید ابراہیم ندوی بن مولانا سید ہاشم ندوی صدر شعبۂ عربی عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے نام حافظہ میں آتے ہیں۔ (ہمیں خوشی ہے کہ مولانا سید ابراہیم ندوی کے فرزند مولانا سید

راشد نسیم ندوی اس وقت ہمارے درمیان موجود ہیں۔) اس شہر میں سلسلۂ فردوسیہ کے متعدد ندوی فضلاء کے علاوہ جن میں متعدد کتابوں کے مصنف ومترجم بھی ہیں ندوۃ العلماء کے دو ممتاز فاضل ،عربی زبان وادب کے رمز شناس اوراس ادارہ کے قابل فخر فرزند مولانا مسعود عالم ندوی اگانوی اور مولانا محمد ناظم ندوی علی نگری مونگیری نے بھی اپنے ابتدائی ایام اپنے اہل خاندان کے ساتھ یہیں گزارے اور یہیں مدرسہ عزیزیہ میں عالمیت کی تکمیل کے بعد ندوۃ العلماء کے شعبۂ ادب میں داخلہ لیا اوراس کے لیے سرمایہ فخر بنے۔

سامعین کرام! اب ہمیں اس شخصیت کا بھی مختصر ذکر کرنا چاہیے جس کی ادبی خدمات پر علمی مذاکرہ کے لیے ہم یہاں یکجا ہوئے ہیں۔ دنیائے ادب میں حضرت سید صاحبؒ کی شخصیت مسلم ہے، اور زاہد ورند دونوں کی بزم میں آپ کو یکساں مقبولیت حاصل ہے، ایک طرف آپ مرشد کامل اور شیخ وقت بھی ہیں، دوسری طرف دنیائے نقد وادب کے امام فن بھی، گیسوئے شعروادب کی مشاطگی ،وآراستگی میں آپ کا حصہ کسی طرح دوسروں سے کم نہیں، لیکن اس کے باوجود حضرت سید صاحب کسی ایسے ادب کے قائل نہیں جو اخلاق باختگی کا وسیلہ اور فحاشی وعریانیت کا ایجنٹ ہو، ان کے نزدیک ادب برائے ادب کا تصور محض ذہنی عیاشی ہے، اپنے شاگرد رشید مولانا مسعود عالم ندویؒ کے نام ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ ”ادب برائے ادب کا تصور ذہنی عیاشی ہے اور دراصل ادب برائے زندگی ہی حق ہے مگر کون سی زندگی؟ وہ زندگی جو اسلام کا مطلوب ہو ”فی الحیاۃ الدنیا و الآخرۃ“، عبارت بلیغ وفصیح جائز لیکن عبارت وکلام میں تکلف وتصنع وتشدق ناپسندیدہ بلکہ منہی وممنوع“۔ حضرت سید صاحبؒ نے اپنے شیخ حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کے خلیفہ ومجاز بننے کے بعد بھوپال میں منعقدہ ترقی پسند تحریک کے ایک اجلاس میں کرشن چند کے ساتھ بحیثیت مہمان خصوصی شرکت فرمائی اوران ترقی پسند ادیبوں کو نصیحت کرتے ہوئے انہیں نافع ادب کی تلقین کی۔ غرض حضرت سید صاحب کے ادبی نظریات وتصورات ایک مستقل موضوع بحث ہیں جو کسی مختصر مقالہ نہیں بلکہ کتاب کا متقاضی ہے۔ حضرت سید صاحب جس عظیم ادارہ کے ترجمان تھے اس نے اپنے زمانہ کے مدارس کی

مروّجہ روایت کے بالکل برعکس زبان وادب کو اپنی ثقافت کا ایک اہم حصہ قرار دیا، اس نے سب سے پہلے یہ بتایا کہ دین وادب کی راہیں جداگانہ نہیں، پاکیزہ تعمیری ادب اس کی گزشتہ ڈیڑھ سو سالہ تاریخ کا اہم باب ہے، اس نے سطحی اور غیر اخلاقی ادب کو کبھی اپنے ذہن میں جگہ نہیں دی، اس کے فضلاء نے عصری اسلوب میں اسلامی حقائق وتاریخ کو پیش کر کے عصری تعلیم یافتہ طبقہ کو اسلامی روایات وتعلیمات پر اعتماد بحال کرنے میں بے نظیر کامیابی حاصل کی ہے، بلاشبہ ان سب میں سید صاحب کا نام اور کام سب سے نمایاں اور ان کی رہنمائی سب سے زیادہ مؤثر رہی ہے، حضرت سید صاحب نے ادبی موضوعات سے زیادہ مذہبی موضوعات پر لکھا۔ انہوں نے اپنی سیرۃ النبی کی پانچ ضخیم جلدوں میں اپنی انشاء پردازی کا جو جوہر دکھایا ہے اور اپنی خطبات مدراس میں فصاحت وبلاغت کا جو قصر شیریں تعمیر کیا ہے وہ ان کا بے نظیر کارنامہ ہے، اور بقول سید صباح الدین عبدالرحمٰنؒ جب زبان وبیان کے اعتبار سے دنیا کی اعلیٰ ترین کتابوں کی فہرست تیار ہوگی تو اس میں یہ کتاب ضرور شامل کی جائے گی۔ حضرت سید صاحبؒ کی ہمہ گیر وہمہ جہت شخصیت کا جس طرح اعتراف ہونا چاہیے وہ اب تک نہیں ہو سکا ہے، ان کی ذات میں بہ یک وقت ایک دیدہ ور مفسر، ایک عظیم محدث، ایک دقیق النظر فقیہ، ایک وسیع النظر متکلم، ایک عظیم انشاپرداز، بے مثال محقق، ادیب اور ناقد کے علاوہ ایک یگانۂ عصر صوفی اور ایک شیخ کامل وپیر طریقت کے مختلف جلوے جس طرح سمٹ آئے تھے وہ ملکوں ملکوں ڈھونڈنے سے بھی نایاب ہی نظر آئیں گے۔ یہ سیمینار خود ان کے شہر میں ہو رہا ہے جہاں ان کی ذات وکمالات سے اس قرب کے باوجود بھی بہت حد تک اجنبیت اور بیگانگی پائی جاتی ہے، جب کہ سید صاحب کی زندگی ہی میں یہاں ان کے علمی آثار کی اشاعت کے لیے ان کے ایک شاگرد مولانا ابوسلمہ شفیع مرحوم نے ایک ادارہ قائم کیا تھا اور سید صاحب کے مضامین کا سب سے پہلا مجموعہ چھاپ کر شائع کیا تھا، نیز جب وہ لندن سے واپس تشریف لائے تھے تب بھی اس شہر کی خلافت کمیٹی نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا تھا۔

اس اجلاس کی منتظم استھانواں کی جو حضرت سید صاحب کے وطن ہی میں شامل

ہے ایک نوخیز ونوعمر تنظیم یونائیٹڈ ویلفیر ایسوسی ایشن ہے جس کے زیر اہتمام علامہ سید سلیمان اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا ہے تا کہ حضرت سید صاحبؒ کے آثار وباقیات ،علوم وافادات اور ان کے ممتاز اہل وطن معاصرین وتلامذہ کے علمی کارناموں کومنظر عام پر لایا جائے ،اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس میں سہولت بہم پہنچائے۔

اس موقع پر ہم اپنے میر کارواں حضرت سید صاحبؒ کے خلف الرشید حضرت مولانا ڈاکٹر سید سلیمان ندوی دامت برکاتہم کا مختصر تعارف بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ڈاکٹر صاحب مدظلہ الولد سر لابیہ کے مکمل مصداق ہیں،سیرت نبوی جوان کے گھر کا خصوصی امتیاز ہے اس کی روایات کے حافظ ہیں اور یہی آپ کا خصوصی موضوع ہے،جنوبی افریقہ کے شہر ڈربن کی یونیورسٹی میں اسلامی علوم وفنون کی تدریس اور اس شعبہ کی صدارت کی ذمہ داری ایک طویل عرصہ تک انجام دینے کے بعد اس خدمت سے سبکدوش ہوکر اب اسی شہر میں مقیم ہیں،شہر میں قرآن پاک کے درس کا سلسلہ جاری ہے۔یورپ کی مختلف موقر دانش گاہوں آکسفورڈ اور کیمبرج وغیرہ کے ممبر اور بہت سے اہم اداروں کے مشیر کار ہیں،اور اہل یورپ اسلامی احکام وتعلیمات کے سلسلہ آپ سے مستفید ہوتے رہتے ہیں۔یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں اسلامی موضوعات پر آپ کے لکچرز ہوتے رہتے ہیں اور ان ملکوں میں اسلام کی ترجمانی کرتے ہوئے اسلام پر مخالفین کے اعتراضات کے جوابات بھی دیتے ہیں،آپ کئی زبانوں سے واقف ہیں،تقریباً پچیس تیس ملکوں کا سفر کر چکے ہیں،ندوۃ العلماء کی تعلیم کے بعد پاکستان میں آپ نے سندھ یونیورسٹی کراچی سے ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور وہیں استاذ ہوئے پھر امریکہ جا کر شکاگو یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی جہاں آپ کے مقالہ کا عنوان ”خلافت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ“ تھا۔اسی کے ساتھ آپ نے معرفت الٰہی کا ذوق بھی پایا ہے اور عارف باللہ حضرت حکیم اختر صاحب کراچی خلیفہ حضرت شاہ ابرارالحق ہردوئی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ ومجاز بھی ہیں،غرض آپ اپنے عظیم المرتبت والد ہی کی طرح ایک بین الاقوامی اور عظیم عالم ہیں،اور اسلام کے دفاع میں سرگرم عمل ہیں،خدائے تعالیٰ آپ کا سایہ تادیر ہم پر قائم رکھے،آمین۔

یادرفتگاں۔ایک مطالعہ

پروفیسر احمد سجاد

عالم اسلام کے معروف عالم دین، دانشور، مورخ، ادیب، صحافی اور شاعر علامہ سید سلیمان ندویؒ کی غمناک تحریروں کا مجموعہ ''یادرفتگاں'' میں مولانا نے تقریباً ۱۳۳ اساتذہ، پیر طریقت، احباب، معاصرین اور دوسرے مشاہیر کی رحلت پر مضامین نہیں ان کے دل کے ٹکڑے صفحۂ قرطاس پر ثبت کیے گئے ہیں۔ جس کا سلسلہ ۱۹۱۴ء میں ان کے استاذ اور مربی و محسن علامہ شبلی نعمانیؒ کی وفات سے جو شروع ہوا تو ان کی وفات ۱۹۵۳ء تک معارف میں جاری رہا۔

موت ایک ایسی تلخ حقیقت ہے جس کو مومن و مسلم اور مشرک و ملحد سبھی اٹل مانتے ہیں۔ چنانچہ مختلف اقوام و ملل میں اس پر سوگ منانے کے مختلف طریقے مروج رہے ہیں۔ اردو میں صنف مرثیہ سے ایک دنیا واقف ہے۔ اسلامی تاریخ میں عرب مورخین نے اپنے اپنے دور کے ہزاروں بزرگوں، فاضلوں، ادیبوں اور ممتاز لوگوں کی وفات کی تاریخ کا تعین کیا ہے۔ علامہ موصوف کو بھی اپنی ان تحریروں کی اہمیت و معنویت کا پورا احساس تھا۔ فرماتے ہیں:

''کیا عجب ہے کہ شذرات کا یہ حصہ ایک دن اس عہد کے اوراق بن جائیں''

(یادرفتگاں۔ص۶)

سچ تو یہ ہے کہ عربی تاریخ کی اس معنی خیز روایت کو علامہ علیہ رحمہ نے اردو میں مستحکم کردیا چنانچہ ''وفیات'' اردو میں ایک نثری صنف کی حیثیت سے ابھر چکی ہے۔ جس میں مشاہیر کی وفات پر ان سے انس، عقیدت یا دلچسپی رکھنے والے ادبا و محققین اپنے اپنے نقطۂ نظر اور تعلقات کی مناسبت سے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہیں۔ یوں متوفین کی زندگی، ان کی خدمات اور کارناموں کے مختلف پہلو تاریخ کا جزو بن جاتے ہیں۔

"یادرفتگاں" کے مرتبین نے ان شہ پاروں کی تاریخی اور ادبی حیثیت کو اجاگر کرتے ہوئے سید صاحب کے "سحر نگار قلم" کا اعتراف کرنے کے علاوہ "ان کے رقیق قلب، محبوب دل، مفکر دماغ کا نگارخانہ" قرار دیا ہے۔ نیز یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ

"گو اس میں استاذ کا ماتم ہے، رفیقۂ حیات کا نوحہ ہے، فضل وکمال کا مرثیہ ہے، اخلاق وشرافت کا رونا ہے، دینداروں کا غم ہے، بے دینوں کا سوگ ہے، لیکن سب سے زیادہ اس میں خود ان کی زندگی کا پرتو ہے اور اس دور کی کہانی ہے جو نہ اب دیکھنے کو ملے گی اور نہ سننے کو"۔

سید صاحب کی یہ واحد کتاب ہے جس میں ان کی طرز تحریر کے ارتقائی منازل آسانی سے یکجا متعین کیے جاسکتے ہیں اور اس کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے یہ دعویٰ بجا ہے کہ اس کتاب کی اشاعت سے اردو ادب میں ایک بیش قیمت اضافہ ہوا ہے۔

موت پر غم والم کا اظہار ایک فطری عمل ہے کہ یہ زندوں اور مردوں کے درمیان ایک دیوار کھڑی کردیتی ہے مگر یہ سچ ہے کہ مسلمان کا غم دنیا کی تمام دوسری قوموں کے غم سے جدا ہے۔ مسلمان، خدا، کائنات اور انسان کے باہمی تعلق کا ایک مخصوص نظریہ اور تصور رکھتا ہے، وہ موت کو زندگی کا خاتمہ نہیں بلکہ ایک نئی زندگی کا آغاز سمجھتا ہے۔ میرؔ کے لفظوں میں

اب تو جاتے ہیں بتکدے سے میرؔ   پھر ملیں گے اگر خدا لایا

سید صاحب کی قدیم وجدید اقدار کی حامل شخصیات سے بلا امتیاز مذہب وملت جو قلبی تعلق تھا اسکا پوری وسعت قلبی سے یہاں اظہار ہوا ہے ان میں ہندو، مسلمان، عیسائی، یہودی، ہندوستانی، انگریز، مصری، ترکی، جج، بیرسٹر، عالم، مسٹر، پیر، فقیر، شاعر، خطیب، سیاست داں، گوشہ نشیں، غیر اور عزیز ہر طرح کی شخصیات جمع ہیں۔ ان کی وسیع القلبی کا اندازہ کیجئے کہ ان سب سے خصوصی تعلقات، برادرانہ خلوص، بزرگانہ شفقت، عزیزانہ محبت میں سب کے لیے چالیس سال تک ان کی آنکھیں اشکبار ہوتی رہیں۔

مولانا موصوف کا کمال یہ ہے کہ ان مختلف فکر وعمل کی شخصیات سے تعلقات میں

قرب وبعد اور خصوصیات کا جوفرق تھا اظہار غم کرتے وقت نوعیت کا یہ فرق طرز بیان سے واضح ہو جاتا ہے۔اس مجموعہ کے شاہ کار مضامین میں ''علامہ شبلی نعمانی، مولانا محمد علی، اقبال، حکیم اجمل، مولانا سجاد کی یاد میں، مولانا اشرف علی تھانوی، حضرت مولانا الیاس کاندھلوی، قائداعظم محمد علی جناح، مولانا شبیر احمد عثمانی، آہ مولانا شیروانی، واحسرتا! کوشمار کیا جاسکتا ہے۔ان سب میں نسبتاً تفصیل سے اظہار خیال کیا گیا ہے۔تحریر کی خوبی یہ ہے کہ ان شخصیات کی خدمات اور کارناموں کو کفایت الفاظ کے باوجود بڑے موثر انداز میں پیش کردیتے ہیں۔''محمد علی'' پرتحریر کا آغاز انہیں کے ایک مصرع سے کیا ہے۔

ع ماتم یہ زمانے میں بپا میرے لیے ہے

سب جانتے ہیں کہ ان کا انتقال ۴رجنوری ۱۹۳۱ء کو ترپن برس کی عمر میں لندن میں ہوا۔ اولین جملہ کے بعد مرحوم کا دوسرا برمحل مصرع استعمال کرکے

ع مارا دیار غیر میں مجھ کو وطن سے دور

مولانا محمد علی جوہر کے بارے میں کس قدر برمحل اظہار تاثر کیا

> ''افسوس وہ پر درد آواز جو ۱۹۱۱ء سے ۱۹۳۰ء تک ہندوستان اور دنیائے اسلام کے ہر قیامت آفریں سانحہ میں صدائے صور بن کر بلند ہوتی رہی ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی'' (ص ۱۳۴)

پھر مختلف حوالوں سے مرحوم کے لیے جو توصیفی فقرے پر مشتمل ایک پوری عبارت ہے وہ قارئین کو تڑپا دیتی ہے۔مثلاً

> ''وہ بے قرار دل، وہ اشک آلود آنکھیں، وہ مترنم لب، وہ آتشیں زبان، وہ پر جوش سینہ، وہ پر زور دست وبازو، شکستہ فوج کا وہ آخری سپاہی جو اعدا کے نرغہ میں تنہا لڑ رہا تھا آخر زخموں سے چور ہو کر ایسا گرا کہ پھر کھڑا نہ ہوا، الوداع محمد علی! الوداع! والسلام الی یوم القیام'' (۱۳۵)

آگے چل کر مختصر فقروں میں سید صاحب نے محمد علی جوہرؒ کے عالم اسلام کے لیے جو گراں قدر خدمات انجام دی تھیں ان کا نہایت بلاغت کے ساتھ احاطہ کرلیا ہے۔

> ''ہندوستان کا ماتم دار، طرابلس کا سوگوار، عراق کے لیے غم زدہ، بلقان کے لیے اشکبار، شام پر گریاں، انگورہ پر مرثیہ خواں، حجاز کا سوختۂ غم اور بیت المقدس کے لیے وقف الم، اے ہند کے آوارہ گرد مسافر! تیرا حق سرزمین اسلام کے چپہ چپہ پر تھا، مناسب یہی تھا کہ تیرے لیے اولین قبلہ اسلام کا سینہ پھٹ جائے اور تو اس میں سما جائے'' (۱۳۵)

ایک بحر مواج ہے جو اپنے پڑھنے والے کو بھی بہائے لیے چلا جاتا ہے۔

''یادِ رفتگاں'' کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں نثری ماتم و مرثیہ ہی نہیں بلکہ اس دور کی مختلف عظیم شخصیتوں سے ان کے ذاتی تعلقات اور واقعات کی وجہ سے خاصا معلومات افزا تاریخی دلچسپی کا احساس ہوتا ہے۔ اکثر مضامین میں ان شخصیات سے بعض ملاقاتوں کا دلچسپ تذکرہ بھی آیا ہے۔ محمد علی سے ان کی پہلی ملاقات ''الہلال'' کے دفتر میں ۱۹۱۳ء میں ہوئی۔ اب ''کامریڈ کے ایڈیٹر کے شباب کی بہار'' سید صاحب کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیے:

> ''دیکھا بالکل پورے صاحب، کوٹ، پینٹ، بوٹ نکٹائی، داڑھی صاف، بڑی بڑی اٹھی ہوئی مونچھیں، سر پر ترکی ٹوپی، لمبا قد، گداز بدن، بھرا ہوا جسم، خندہ جبیں'' (۱۳۶)

سید صاحب کی تعلیم و تربیت، بڑی بڑی علمی و ادبی شخصیات سے ان کی صحبت، وسعت مطالعہ و تحقیق اور زرخیز ذہن کی وجہ سے وہ ہر مرحوم کی یاد کے حسب حال الفاظ اور تراشیدہ فقروں سے ایک سماں باندھنے اور سیرت کی داخلی و خارجی منظر کشی پر پوری طرح قادر تھے۔ ''ماتم اقبال'' کے زیرِ عنوان، ڈاکٹر اقبال کی رحلت پر سید صاحب کے زورِ بیان کا اندازہ کیجیے

> ''وہ ہندوستان کی آبرو، مشرق کی عزت اور اسلام کا فخر تھا، آج دنیا ان ساری عزتوں سے محروم ہوگئی، ایسا عارف فلسفی، عاشق رسول شاعر، فلسفۂ اسلام کا ترجمان اور کاروانِ ملت کا حدی خواں صدیوں کے بعد پیدا ہوا تھا اور شاید صدیوں کے بعد پیدا ہو''۔

آگے چل کر موصوف نے اقبال کے مختلف مجموعہ ہائے کلام کا بڑے معنی خیز انداز میں تذکرہ کیا ہے:

> ''اس کے دین کا ہر ترانہ بانگِ درا، اس کی جانِ حزیں کی ہر آواز زبورِ عجم، اس کے دل

کی ہر فریاد پیام مشرق، اس کے شعر کا ہر پر بال جبریل تھا، اس کی فانی عمر گو ختم ہوگئی۔
لیکن اسکی زندگی کا ہر کارنامہ جاوید نامہ بن کر ان شاء اللہ باقی رہے گا۔" (۱۸۲)

سید صاحب کی نباضی کی داد دی جانے چاہیئے کہ انہوں نے دو ملی شخصیات کے بارے میں جو پیشین گوئی کی تھی وہ آج تک حرف بحرف صحیح ہے۔

"واقعہ یہ ہے کہ نئی تعلیم نے اپنے ساٹھ ستر برس کے طویل عرصہ میں دو ہی سچے غمخوار پیدا کیے ایک محمد علی مرحوم اور دوسرا اقبال مرحوم"۔ (۱۸۳)

ان شخصیات کی یاد کو تازہ کرتے وقت سید صاحب اپنی دانشورانہ دینی بصیرت سے ہمیشہ کام لیتے تھے۔ ان کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"اقبال صرف شاعر نہ تھا، وہ حکیم تھا، وہ حکیم نہیں جو ارسطو کی گاڑی کے قلی ہوں یا یورپ کے نئے فلاسفروں کے خوشہ چیں، بلکہ وہ حکیم جو اسرار قدرت کا محرم اور رموز فطرت کا آشنا تھا"۔ (۱۸۴)

سید صاحب علامہ شبلی کے شاگرد، مولانا ابوالکلام آزاد کے معاون مدیر الہلال اور کئی زبان و علم کے ماہر تھے اس لیے وہ اختصار کے باوجود مرحوم شخصیت کے سلسلے کی بنیادی باتوں کو نہایت موثر انداز میں پیش کرنے پر پوری طرح قادر تھے۔ انگلستان کے مشہور مستشرق پروفیسر مارگولیتھ پر سید صاحب کی جو تحریر ہے وہ ایک صفحہ سے بھی کم ہے مگر چند ہی جملوں میں آنجہانی کی سرشت اور ایک اہم راز کا انکشاف بھی کر دیا ہے:

"وہ نسلاً یہودی پھر عیسائی ہوگئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کو اسلام اور پیغمبر اسلام سے اکہری نہیں دوہری عداوت تھی۔ ان کی عمر بھر کا سرمایہ اسلام پر مہذب غارتگری ہے"۔......... ان کی سب سے بڑی کتاب آنحضرت ﷺ کی سیرت ہے جس کو دیکھ کر مولانا شبلی مرحوم بے چین ہو گئے تھے اور اپنی سیرت نبوی کی بنیاد ڈالی تھی:

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد (۲۰۶)

سید صاحب چونکہ شاعر بھی تھے اس لیے نثر میں اپنے احساسات و جذبات کو حسین اور موثر انداز میں ایجاز و اختصار کے ساتھ پیش کرنے کا انہیں گر معلوم تھا۔ باتوں ہی باتوں

میں وہ مرحوم شخصیات کے خاندانی پس منظر، مزاج، عادات واطوار، منفرد نفسیات، ذاتی تعلق کی نوعیت، سیاسی صورت حال، واقعاتی دلچسپیوں اور رموز حیات وممات کو بڑے عبرتناک انداز میں پیش کر دیتے تھے۔ ''آہ! مولانا شیروانی'' کے تحت لکھتے ہیں کہ ''مرحوم کی زندگی ہی میں ان کے واقعات اور خاندان شروانی کے بعض احوال لکھوا کر دارالمصنفین میں رکھ لیے تھے''، مگر لاہور کے کسی اخبار میں ان کی موت کی خبر دیکھی تو اپنی دوری ومجبوری پر لکھتے ہیں کہ:

''اب جب کہ ان کا سانحہ پیش آیا تو تقدیر کی مجبوری دیکھیے کہ کوئی تدبیر کام نہ آئی''۔

سید صاحب اپنی تمام صلاحیتوں، زور بیان، کثرت ملاقات کے باوجود تعلقات کو نبھانے میں بزرگوں اور خوردوں سے حفظ مراتب کا بطور خاص خیال رکھتے تھے۔ ان کے تہذیب نفس اور کثیر الاحبابی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ علامہ شبلی کی علمیت اور مولانا اشرف علی تھانوی کی روحانیت سے یکساں فیض یاب تھے، ان کے لائق صاجزادے ڈاکٹر سید سلمان ندوی نے کانگریسی اور لیگی نظریات کی اہم شخصیات سے ان کے مساوی تعلقات کو دیکھتے ہوئے اپنے والد سے جب یہ بیباکانہ سوال کیا کہ صاف کھل کے بتائیے کہ آپ کانگریسی ہیں یا لیگی؟ تو سید صاحب نے جواباً کہا کہ

''دماغ کانگریسی ہے اور دل لیگی، یہ اشارہ مولانا شبلی کے کانگریس کے رجحان کی طرف تھا اور مولانا تھانوی کا رجحان مسلم لیگ کی طرف تھا''۔ (معارف فروری۱۹ء۔ علامہ سید سلیمان ندوی کے مابین تعلقات کی سرگذشت از مولانا سید سلمان ندوی۔ ص۹۴)

''حسرت نامہ'' میں مولانا حسرت موہانی کی جراتمندانہ سیاسی سرگرمیوں کے نتیجے میں اسی بے بدل شاعر کی شاعری، اردوئے معلّی کی اجرائی اور چکی کی مشقت کے مراحل سے گزر کے جب قرض لے کر سودیشی کپڑوں کی دکان قائم کر لی تو بزرگ علامہ شبلی نے نوجوان اور پرجوش حسرت سے ایک بار کہا کہ

''تم آدمی ہو یا جن پہلے شاعر تھے، پھر پالیٹیشین بنے اور اب بنیئے ہو گئے'' (۴۲۲)

اس چو پہل شخصیت کے اوصاف کے پس پردہ یہ حقیقت تھی:

''ہزاروں انقلابات کے باوجود حسرت اپنی مذہبی زندگی اور صوفیانہ مشرب میں ہمیشہ غیر متزلزل رہے''۔

یہی وجہ ہے کہ گاندھی جی اور کانگریس سے بہت پہلے کانپور کے اجلاس میں آزادئ کامل کی انقلابی تجویز پیش کر کے ایک ہنگامہ برپا کردیا تھا۔

''حسرت اردوئے معلّٰی میں شعر وسخن کے پھول اور سیاست کے کانٹے ایک ساتھ ناظرین کے سامنے پیش کرنے پر پوری قدرت رکھتے تھے۔'' (۴۱۹)

سید صاحب کا حافظہ بھی غضب کا تھا۔ یادداشتوں کی تحریر کے وقت پرانے واقعات کو بڑے سلیقے سے صفحۂ قرطاس پر پیش کردیتے تھے۔ درمیان میں برمحل اردو فارسی کے مصرعے اور اشعار بھی پیش کرتے۔

''فقیہ الامت مولانا کفایت اللہ'' کی وفات ۳۱/دسمبر ۱۹۰۲ء پر اپنی ۱۹۱۴ء سے مرحوم سے تعلقات کی یاد تازہ کرتے ہوئے تقریباً پانچ صفحات لکھ پائے تھے کہ ''علم وفضل کے ماتم گساریہیں تک پہنچے تھے کہ خود ان کے رخصت کا وقت آگیا اور موصوف خود بھی یادرفتگاں کے قافلے میں شریک ہوگئے''۔

بے موقع نہ ہوگا اگر یہیں پر مولانا منظور حسین صدیقی عرف ماہر القادری، ہندوپاک کے معتبر ادیب وناقد، ہردلعزیز شاعر، مدیر 'فاران' کا بھی سرسری تذکرہ کردیا جائے۔موصوف ۱۹۰۷ء میں اپنے آبائی وطن کسیر کلاں، بلند شہر میں پیدا ہوئے۔مئی ۱۹۷۸ء میں جدہ کے ایک مشاعرے میں تشریف لے گئے۔ اسٹیج ہی پر اسلامی اقدار کا مذاق اڑانے والے ایک شعر کے خلاف کلمۂ احتجاج بلند کرتے ہوئے اپنے رب سے جاملے۔فاران میں مرحومین کی وفات پر مشتمل ان کے مضامین کے مجموعے دو جلدوں میں ''یادرفتگاں'' ہی کے زیر عنوان نومبر ۱۹۸۴ء تک لاہور سے منظر عام پر آچکے ہیں۔مولانا ماہر القادری کے ان مضامین پر علامہ سید سلیمان ندوی کے اثرات واضح طور پر محسوس ہوتے ہیں۔البتہ مولانا ماہر سوانحی کوائف قدرے تفصیل سے پیش کرنے کے عادی تھے،نواب میر عثمان علی خاں پر موصوف نے ۳۹ صفحات (ص ۸۴ تا ۱۲۳۔جلد دوم) صرف کیے ہیں۔

کیونکہ درمیان میں جب مولانا عبدالقدیر بدایونی مرحوم کا تذکرہ آگیا تو ان پر الگ سے کوئی مضمون لکھنے کے بجائے نواب میر عثمان علی خاں والے مضمون ہی کے حاشیے میں دسیوں صفحات تک ان کا تفصیلی تذکرہ کرتے رہے۔مولانا ماہر ان مضامین میں بیشتر اپنے ذاتی تعلقات کا حوالہ علامہ سید سلیمان ندوی صاحب کی طرح دلچسپ انداز میں پیش کرنے پر قادر تھے۔البتہ زبان و بیان اور طرز اظہار میں بین فرق محسوس ہوتا ہے۔مولانا ماہر بسا اوقات ''بدو شعور اور حلاّل مشکلات'' جیسے عربی و فارسی آمیز الفاظ بلا جھجک استعمال کرتے تھے۔اس کے برخلاف علامہ سید سلیمان ندوی کی زبان زیادہ سادہ مگر فصیح و بلیغ ہے۔سید صاحب سمندر کو کوزے میں بھرنے پر قادر تھے تو ماہر صاحب دریا کو کوزے میں بھرنے کے عادی۔دونوں مرحومین کی باطنی و ظاہری خصوصیات کی منظر کشی پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔سچ پوچھیے تو ان دونوں علمائے کرام نے اپنی اپنی ''یادرفتگاں'' کے ذریعہ اردو کی نثری صنفوں میں ''وفیات'' کی ایک نئی صنف کی داغ بیل ڈال دی۔

پروفیسر احمد سجاد
سابق ڈین فیکلٹی آف ہیومنیٹیز
وصدر شعبہ اردو، رانچی یونیورسٹی
رانچی۔جھارکھنڈ۔
Mob: 9431359971

حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی شخصیت کے عناصر ترکیبی

مولانا عمیر الصدیق دریابادی ندوی

حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کے حالات میں آتا ہے کہ جب وہ پیدا ہوئے تو ان کے دادا حکیم محمدی نے تاریخ پیدائش اس مصرعے سے نکالی:

شدہ مہر تاباں ز برج کمال

خدا جانے کس عالم اور کس گھڑی میں یہ الفاظ زبان پر آئے کہ سید صاحب کی بعد کی پوری زندگی اس مصرعہ کی تفسیر بن گئی، یا پھر ان کی کتاب زندگی کا عنوان ٹھہر گئی، لوگ طرح طرح سے اس کتاب کا مطالعہ کرتے رہے، اور اپنے اپنے ذوق سے اپنے مطالعہ کو عنوان دیتے رہے، مثلاً علوم اسلامیہ کے جوئے شیر کا فرہاد، سید الطائفہ، جہان علم ودانش، ساقی جام شریعت، کاشف اسرار سیرت، ناظم اجرائے ملت، جلوۂ گل سر سبد گلشن ندوہ، اور سب سے بڑھ کر نازو افتخار دار المصنفین وغیرہ۔

میں نے بھی ایک جگہ لکھا کہ سید صاحب گذشتہ صدی میں صرف ہندستان کی ملت اسلامیہ ہی نہیں پوری ملت کے سرمایہ کے نگہباں تھے، خصوصاً اسلامی ہند کی تاریخ میں اگر صرف گنتی کے چند نام لئے جائیں جن سے علم شریعت وسیرت کا ایک جہان آباد ہوا ہے تو بے شبہ اس مختصر ترین تحریر میں بھی علامہ سید سلیمان ندوی کا نام نامی نمایاں نظر آئے گا۔

اس کی تفصیل یہاں مقصود نہیں، اجمالاً یہی کہا جاسکتا ہے کہ سیرت النبی، رحمت عالم، ارض القرآن، سیرت عائشہ، امام مالک، عربوں کی جہاز رانی، حیات شبلی اور بے شمار مقالات ومضامین جہاں اسلامی علوم کی قلمرو کی توسیع کرتے ہیں، وہیں ان کے وقت کا ایک ایک لمحہ قومی وسیاسی خدمات کے لئے اس طرح صرف ہوتا رہا کہ ان کا ہر سانس متاع گراں میں تبدیل ہوتا رہا۔

اس اجمال کی ایک شرح ہم کو اس طرح ملی کہ ”سید صاحب کے لئے علم کا معاملہ کسی پیشہ یا ضرورت یا مجبوری اور مصلحت کا معاملہ نہ تھا، علم ان کا گوشت و پوست بن کر ان کے خون میں جاری وساری ہوگیا تھا، وہی ان کی غذا، وہی ان کی تفریح اور وہی ان کا اوڑھنا بچھونا“۔ یہی نہیں اہل نظر کی نظر میں ”شاید علمائے معاصرین، کم سے کم ہندستان کے معاصرین، کم سے کم ہندستان کے فضلاء مدارس میں کسی کے ضمیر میں عقل وعشق، قدیم و جدید، مشرق ومغرب اور دین ادب ودین وفلسفہ کا معرکہ اس طرح برپا اور تازہ نہ ہوگا جس طرح مغرب کے اس فاضل، سیرت النبی کے اس مصنف، میدان سیرت اور بزم ادب کے اس محرم راز اور یورپ کے اس سیاح کے ضمیر میں ہوا تھا“۔ اسی نظر کا یہ اعتراف بھی سن لیجیے کہ ”مولانا سید سلیمان ندوی جیسا جامع فنون اور متنوع الذوق میں نے نہیں دیکھا“۔

اب اس کی تشریح کیسے کی جائے، سید صاحب کے تنوع کا ہر گوشہ تفصیل طلب ہے، مثال کے طور پر ان کے ادب ہی کو لے لیجیے، کہا گیا کہ جن اہل قلم نے لیلائے اردو کے گیسوؤں کو سنوارا اور اس کو علمی وادبی زبان بنایا اس میں سید صاحب کا ممتاز مقام ہے۔ لوگوں نے سلیمانی اسلوب کی خصوصیات گنواتے ہوئے کہا کہ ”ان کے مزاج کا ٹھہراؤ، سنجیدگی ان کے اسلوب کا آہنگ بناتے ہیں۔ انہیں قاری کی توجہ کو اپنی طرف مائل کرنے کا ڈھنگ معلوم ہے، وہ جوشیلے خطیب نہیں لیکن وہ برموقع خطابت کی ہلکی سی چاشنی سے عبارت کو لطیف ولذیذ بنا دیتے ہیں“۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ انداز تحریر صاف اور سلیس ہے، سادگی بے رنگ نہیں، اور سب سے بڑھ کر خلوص ایسا ہے جو الفاظ میں کیمیاوی تغیرات پیدا کرتا ہے، اور اسی لئے ان کے یہاں بے حد تاثر ہے، ان کے یہاں علمیت ہے لیکن ایسی نہیں جو کانوں کو گراں محسوس ہو۔ ان کے نزدیک رنگینی کا نام ادبیت نہیں بلکہ وہ اپنے خیالات اور الفاظ کو اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ پڑھنے والا عالمانہ حقیقتوں میں ادبیت کے مزے لیتا ہے اور سب سے بڑھ کر مولانا دریابادی کے یہ الفاظ ہیں جو گویا زبان زد ہو چکے ہیں لیکن ان کو دہرانے میں ہر بار نئی لذت ملتی ہے کہ

''سید صاحب کی نثر پر اگر قلم اٹھایئے تو دیدہ و دل حیران کہ شروع کہاں سے کیجئے اور حد تمت کہاں پہنچ کر کھینچئے ۔ سیرۃ النبی ﷺ کی ضخیم مجلدات سے لے کر خیام، خطبات مدراس اور رحمت عالم تک بڑی اور چھوٹی کتابوں تک کون سی ایسی ہے جہاں سلیمان ایک خشک ملاّ نے معلوم ہوتے ہیں، اور صحت زبان وسلاست بیان نمایاں نہ ہو، شستگی، متانت شرافت، یہ تو ان کے اسلوب کے جوہر اصل ہیں ۔اور اس پر شوخی وظرافت کی گلکاریاں اور حسن صناعت کی سحر طرازیاں جیسے خاتم سلیمانی میں نگیں''۔

علم وادب کی یہ جامعیت بھی عجیب ہے کہ ایک طرف تو الحادو بے دینی کے بڑے بڑے منہ زور جنات کو بوتلوں میں بند کیا، وہیں الفاظ و معانی کی لطیف پریاں بھی شیشہ میں اتارتے رہے ۔ہم سے کہا گیا کہ سید صاحب کے اسی ادبی پہلو سے سیرت النبی کا مطالعہ کیا جائے ،لیکن یہ منصب تو مولانا دریابادی اور رشید احمد صدیقی جیسوں کو زیب دیتا ہے، اور وہ اس سے عہدہ برآ بھی ہوئے ۔

ہم نے سوچا کہ اس سلیمان کے علم وحکمت کی وہ بنیادیں کیوں نہ دیکھی جائیں جن پر قصر سلیمانی کی ایسی تعمیر ہوئی جس کے بعد یہ کہنا برحق ہے کہ الحمدلله الذی فضلنا علیٰ کثیر من عبادہ ۔

اس لئے ہم نے خود حضرت سید صاحب کے وہ مضامین دیکھے جن میں ایک تو وہ ہے جہاں شخصیات سے متاثر ہونے کی بات ہے، اور دوسرے میں ان کتابوں کا ذکر ہے جن کے فیض سے مملکت سلیمانی کو وسعت اور آفاقیت کی نعمت ملی ۔

۱۹۵۰ء کے معارف کے جولائی کے شمارہ میں شاہ معین الدین ندوی نے سید صاحب کی ایک تحریر بعنوان ''جن سے میں متاثر ہوا'' شائع کی اور اس نوٹ کے ساتھ کہ'' آل انڈیا ریڈیو دہلی نے کئی سال پہلے تقریروں کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا جس میں حضرت سید صاحب نے بھی تقریر فرمائی تھی، برسوں بعد یہ تحریر معارف میں پیش ہے'' ۔یہ تقریر یا مضمون واقعی ہر اس طالب علم کے لئے ہدایت نامہ ہے جو علم وادب کی دنیا میں اپنی کچھ پہچان بنانے کی

تمنا رکھتا ہے، ہدایت نامہ کیا یہ مشعل ہدایت ہے، اس میں انیسویں صدی کے آخری مرحلہ پر دو تحریکوں کا ذکر ہے، ایک تو سرسید کی تحریک اور دوسری وہ جہاں علماء کو نئے خیالات سے آشنا کر کے پرانی تعلیم کی بات کی از سرِ نو تنظیم کی بات تھی، سید صاحب نے لکھا کہ دونوں آوازیں کانوں میں پڑیں مگر میرا خاندانی ماحول اسی دوسری تو تحریک سے متاثر تھا، اس لئے دوسری تحریک سے دلچسپی ہوئی، اور وہ بڑھتی گئی، پھیلتی گئی اور وہی میری زندگی کا جزو بن گئی۔

یہاں بالواسطہ سید صاحب نے انسان کی تشکیل میں خاندانی ماحول کی اہمیت بیان کر دی اور آگے اس کا ذکر پھر یوں آیا کہ والد صاحب نے آرہ کے مدرسہ احمدیہ میں بھیجنا چاہا لیکن خاندان ہی کے دوسرے بزرگوں نے ندوہ میں داخلہ کی بات زیادہ مناسب سمجھی، اور عمل بھی اسی پر ہوا، درمیان میں چند مہینوں کے لئے ان کو خانقاہ پھلواری میں بھیج دیا گیا، یہ چند روزہ قیام بھی کیا خوب تھا کہ خانقاہ کی قوالیوں کے اثر سے شعر و سخن کی فضا میں سانس لینے کا موقع مل ملا اور یہیں کم عمری کے باوجود عبدالحلیم شرر کے ناول ''منصور موہنا'' کو دیکھنے کا موقع ملا اور جس کا اثر یہ ہوا کہ جب کتاب ختم ہوئی تو سید صاحب کی آنکھوں سے چشمے ابل پڑے بقول ان کے خوب پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ ادب سے رشتوں کی یہ بنیادیں کتنی اہم تھیں اور آج بھی ہوسکتی ہیں، سید صاحب نے شاید اسی لئے ان کا ذکر کیا۔

ندوہ آنے سے چند دن پہلے پٹنہ میں ندوہ کا اجلاس ہوا اس میں شیخ سر عبدالقادر کی تقریر تھی، سید صاحب نے محو حیرت ہو کر تقریر سنی اثر یہ ہوا کہ ان کے دل میں ایسی ہی تقریر کرنے کا جذبہ پیدا ہوا، سید صاحب کا یہ جذبہ کس قدر شدید تھا کہ نصف صدی گذرنے کے بعد بھی ان کے دل سے اس کی یاد نہیں گئی، لکھتے ہیں:۔

''جلسہ کے اختتام پر شوق نے بال و پر پیدا کئے اور میں اڑ کر لکھنؤ پہنچا اور ندوۃ العلماء کی درس گاہ میں داخل ہو گیا، اور یہ وہ مقام تھا جو اس وقت سارے ہندوستان کے علماء کا مرکز اور قوم کے بڑے بڑے لوگوں کا مرجع بنا ہوا تھا، یہیں آنکھوں نے سب کچھ دیکھا اور کانوں نے سب کچھ سنا۔

ندوہ میں مولانا فاروق چریا کوٹی ملے، استاد کی حیثیت سے سید صاحب نے صرف زانوئے تلمذ تہہ نہ کئے بلکہ اور کچھ بھی دیکھا، دیکھا کہ استاد کے پڑھانے کا انداز کچھ اور ہی ہے بحرف نظری نہیں عملی ہے وہ کتاب کے لفظوں کے پابند نہیں، بلکہ فن کے مسائل سے شاگردوں کو روشناس کراتے ہیں، جس کی وجہ سے طالب علم فن پر قابو پالیتا ہے۔ سید صاحب کی عمر اس وقت کیا رہی ہوگی لیکن وہ سید صاحب تھے، لکھتے ہیں کہ چند دنوں ہی میں وہ کیفیت پیدا ہوگئی کہ آنکھوں سے پردے ہٹ گئے، اور وہ مسئلے جو پہلے استادوں کے سمجھانے سے سمجھ میں نہیں آتے تھے وہ روز روشن کی طرح عیاں ہوگئے۔ ایک سعید شاگرد کی طرح سید صاحب نے اعتراف کیا کہ مولانا فاروق پہلی شخصیت تھے جس نے ان کے دماغ پر پرتو ڈالا۔

یعنی تحریر پر پہلا اثر شرر کا اور دل ودماغ پر پرتو مولانا فاروق چریا کوٹی کا۔ شیخ عبدالقادر کا مخزن صحیح معنوں میں مخزن تھا، بقول سید صاحب آج کل کے بہت سے بوڑھے اہل قلم اس کے نوجوان مضمون نگار تھے، سید صاحب کا پہلا مضمون اسی مخزن سے نمودار ہوا، صاف لکھا کہ مخزن کو پڑھ کر مضمون لکھنے کی تحریک دل میں پیدا ہوئی۔

۱۹۰۴ء میں الندوہ میں لکھا، مولانا حکیم سید عبدالحی نے اس میں پر متوجہ کیا دو مضمون لکھے بھی جو علم حدیث اور منطق پر تھے، کتابت ہو چکی تھی کہ مولانا شبلی آگئے، سید صاحب نے اسی آنے کو یوں بیان کیا کہ ''مگر عین وقت پر میری علمی زندگی کے اصلی رہنما مولانا شبلی ۱۹۰۵ء میں ندوہ آگئے''۔ مولانا نے ایک مضمون میں تو کچھ اصلاح دی، دوسرے کو مسترد کر دیا، کیوں؟ سید صاحب کے الفاظ میں ''اس میں شرریت زیادہ تھی''۔ شبلی آئے تو تقلید ان ہی کی شروع ہوئی مگر اسی درمیان آزاد کی سخندان پارس کی دلکشی نے اس کی تقلید پر مجبور کر دیا، اس لئے ''یہ طرز تحریر ایسا تھا کہ جو آمد ہو تو کیا کہنا اور بد قسمتی سے کہیں آورد ہو تو اس سے برا کوئی نہیں''۔ اس موقع پر ذرا تھم کر سید صاحب نوجوان اور مبتدی سید صاحب کی تنقیدی صلاحیت کو سلام کر لیجئے، خیر پھر شبلی کی راہ اختیار کرنا پڑی، سید صاحب کے لفظوں میں ناچار ہو کر کیونکہ علمی مضامین کے لئے ان کے طرز سے بڑھ کر دوسرا طرز کارآمد نہیں۔

سیاسی ذوق بھی مولانا شبلی کے فیض کا اثر رہا درمیان میں الہلال کی وجہ سے ہلالیت کی چمک آ گئی لیکن پھر وہی "چند روز ادھر ادھر بہک کر اسی راستہ پر آ گیا جس پر استاذ مرحوم نے مجھے لا کر کھڑا کر دیا تھا۔

شعر و ادب میں سید صاحب نے امیر مینائی کا اثر اس طرح قبول کیا کہ طلبہ کے مشاعروں میں امیر کی پیروی کا دعویٰ کرنے لگے، یہ روداد بڑی دلچسپ ہے، سید صاحب نے شعر و سخن کی اس دلچسپی کو ایسے جرم سے تعبیر کیا ہے جسے وہ چھپانا چاہتے تھے، امیر مینائی کا رنگ چڑھا کہ شبلی کی وہ شاعری سامنے آئی جس کو سید صاحب نے نئی اردو شاعری کی طرح ڈالنے سے تعبیر کیا، خود اسی رنگ میں نوحۂ استاذ لکھا، مگر جب ایک دوست نے یہ کہا کہ جب تک انسان کو کسی فن میں کامل نہ ہو جائے اس کو دوسروں کے سامنے عرض ہنر نہیں کرنا چاہئے، سید صاحب نے بقول خود اسی دن بساط سخن لپیٹ دی، شاعری سے توبہ کر لی کبھی دل کے تقاضے سے کچھ کہا بھی تو اس کو عیب کی طرح چھپایا اور اگر وہ چھپ نہ سکا چھپ گیا تو نام کو رمز و اشارہ بنا دیا۔

سید صاحب کو سید صاحب بنانے میں مولانا محمد علی مونگیری کی ایک گفتگو اس لئے یاد رہی کہ "پھر تمام عمر ذریعہ علوم اور مقصد علوم کے درمیان مغالطہ نہیں کھایا"۔

سید صاحب جن سے متاثر ہوئے ان میں ایک نام مولانا حمید الدین فراہی کا بھی ہے، تاثر کی وجہ کیا تھی کہ وہ ثانوی علوم کی بھول بھلیوں سے نکل کر اصل مقصد کی منزل تک پہنچ گئے تھے، لکھا کہ سیرت کی تیسری جلد میں جو معجزات پر ہے ان ہی کے فلسفہ کی تقلید کی ہے۔

اس مضمون میں حرف آخر پھر علامہ شبلی پر رکا، وہ کس طرح نو آموزوں کی تربیت کرتے تھے، پہلے معلومات کی تلاش، مستند حوالے، معنی کے ساتھ، عبارت کی چستی، طرز ادا کی شگفتگی، تشبیہ و استعارہ کی ندرت، پامال معلومات، مبتذل محاورات اور عامیانہ الفاظ سے پرہیز، شبلی کا یہی طریقہ تھا اور یہی طریقہ سید صاحب کا رہا۔

یہ تو اثر انداز شخصیت کا ذکر تھا۔ موثر کتابوں میں سید صاحب نے تقویۃ الایمان کا ذکر کیا کہ بچپن میں اس کتاب کی صرف خواندگی نے وہ اثر ڈالا کہ بیسیوں اثر آندھیاں آئیں

ہخیالات کے طوفان اٹھے مگر اس کتاب کی بدولت جڑ سے اسے کوئی اور نہ ہلا سکا، غزالی ورازی اور ابن رشد کے دلائل یکے بعد دیگرے نظر سے گذرے لیکن اسماعیل شہید کی تلقین اپنی جگہ رہی۔

ندوہ آئے تو عجالۂ نافعہ پھر بستان المحدثین اور تذکرۃ الحفاظ نے علم حدیث اور امام مالک سے وہ تعلق پیدا کر دیا جس کی وجہ سے رجال اور رجال سے تاریخ کے راستے ہموار ہوتے گئے۔

استھانواں کے مولانا وحیدالحق کی ایک کتاب مغنی الصبیان نے وہ شوق پیدا کیا جس نے ادب عربی پر توجہ مرکوز کی، نتیجہ میں دروس الادب سامنے آئی، عربی ادب کی تعلیم کے سلسلہ میں مولانا فاروق اور مولانا عبدالحی کا ذکر کیا مگر ایک جملہ بڑے مزہ کا بھی قلم کے سپرد کر دیا کہ یہ دونوں بزرگ متاخرین کے طرز کے زخم خوردہ تھے، شبلی نے دلائل پڑھوا کر متقدمین کے طرز انشاء کی نقالی کا شوق پیدا کیا، حماسہ اور نقدالشعر نے اس ذوق کو اور جلا بخشی۔

علم کلام کا شوق سید صاحب کے لفظوں میں تمام تر علامہ شبلی کی تربیت کا نتیجہ ہے۔وہ ملل نحل، فصل فی الملل، کشف الادلہ اور حجۃ اللہ پڑھواتے رہے، یہ اور بات ہے کہ آخر آخر ابن تیمیہ اور ابن قیم کی کتابوں نے ہر نقش کو مٹا ڈالا اور ہر رنگ کو بے رنگ کر دیا، لیکن ابھی آخری جلوہ باقی تھا، یہ جلوہ قرآن پاک کا تھا، شبلی نے اس کا بھی آغاز کیا اور مولانا فراہی کی صحبتوں میں یہ چمکا، آگے بڑھتا گیا، اثر یہ ہوا کہ سیرۃ نبوی کی ہر بحث کی بنیاد قرآن مجید بنا، کیا بات فرمائی کہ قرآن پاک میری عمارت کی بنیاد ہے اور حدیث پاک اس کے نقش ونگار ہیں، اور اب یہی دونوں میرا سرمایہ اور یہی دونوں میری زادراہ ہیں، ایک اصل ہے دوسرا ظل، ایک وحی جلی ہے دوسرا خفی، ایک دلیل ہے دوسرا نتیجہ، جس کو یہ ایک دو نظر آتے ہیں وہ احول ہے، ولاحول ولاقوۃ الا باللہ۔

مولانا سید سلیمان ندوی کی اردو شاعری اور تحریک آزادی میں حصہ

مولانا ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی شمسی

مولانا سید سلیمان ندوی کے والد کا نام سید ابوالحسن تھا۔صوبہ بہار کے ایک مردم خیز گاؤں دسنہ میں ۲۲/نومبر ۱۸۸۴ء کو آپ کی ولادت ہوئی۔ جو بہار شریف سے قریب ہے۔گھر پر ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کچھ دنوں پھلواری شریف اور دربھنگہ میں تحصیل علم کے لئے رہے ۔۱۹۰۱ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخل ہوئے اور وہیں سے فراغت حاصل کی۔

مولانا سید سلیمان ندوی کے سلسلہ میں عام طور پر لوگ جانتے ہیں کہ وہ علمی شخصیت کے حامل تھے۔ان کی دیگر خدمات پر بہت کم توجہ دی گئی۔ میں یہاں ان کی دو اہم خدمات پر روشنی ڈال رہا ہوں۔اردو شاعری اور تحریک آزادی

مولانا سید سلیمان ندوی کا اردو زبان وادب کی خدمات میں اہم رول رہا ہے۔تحقیق،تنقید،اور اردو شاعری میں ان کے خدمات نہایت ہی اہم ہیں۔یہاں ان کی اردو شاعری کا ایک مختصر خاکہ پیش کیا جارہا ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی زمانہ طالب علمی ہی سے اردو زبان وادب سے دلچسپی رکھتے تھے ۔چنانچہ مدرسہ امدادیہ دربھنگہ کے انجمن طلبہ میں ایک تحریر پڑھی تو اساتذہ نے داد دی۔اور تحریر پٹنہ کے مشہور ہفتہ وار اخبار الپنچ میں شائع ہوئی۔۱۹۰۱ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے اور وہیں سے فراغت حاصل کی۔ندوۃ میں ان کی علمی وادبی ذوق کی تربیت

ہوئی اور کچھ شعروسخن کی مشق شروع کی۔

مولانا سید سلیمان ندوی صوبہ بہار کے جید عالم تھے۔آپ مولانا شبلیؒ کی تربیت میں رہے۔مولانا شبلیؒ کے پاس مصروشام کے عربی رسائل بکثرت آتے تھے۔سید صاحب ان کا برابر مطالعہ کرتے رہے۔جس سے ان میں جدید عربی کا ذوق پیدا ہوا۔اور رفتہ رفتہ ایک اچھے ادیب شمار کئے جانے لگے۔

۱۹۰۴ء میں مولانا شبلیؒ نے ندوۃ کی طرف سے ایک سالانہ رسالہ ''الندوہ'' نکالنا شروع کیا۔سید صاحب طالب علمی کے زمانہ سے ہی ان میں علمی وادبی مضامین لکھنے لگے۔

آپ کی تصانیف میں سیرت النبی، ارض القران خطبات مدراس۔عرب وہند کے تعلقات، حیات شبلیؒ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مولانا ۱۹۴۶ء میں نواب بھوپال کے اصرار پر ان کی ریاست کے دارالقضاء اور جامع مشرقیہ کے امیر کے عہدہ پر مامور ہوئے۔یہاں اکتوبر ۱۹۴۹ تک قیام رہا۔اسی سال حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے۔اور وہاں سے واپسی کے بعد جون ۱۹۵۰ء میں پاکستان ہجرت کرگئے۔آپ کی سوانح ''حیات سلیمان'' شائع ہوچکی ہے۔(۱)

مولانا سید سلیمان ندوی عربی، فارسی اور اردو میں پوری مہارت رکھتے تھے۔انہوں نے اردو زبان ادب کی دل و جان سے خدمت کی۔علامہ شبلیؒ کی تربیت نے ان میں ادبی ذوق پیدا کردیا۔وہ شاعری بھی کرتے تھے۔اور رمزی تخلص کرتے تھے۔ارمغان سلیمان اردو شاعری کا مجموعہ ہے۔جسے ۱۹۶۶ء میں کراچی میں طبع کیا گیا۔بہار کی اردو نعتیہ شاعری میں تحریر ہے۔بقول رفقائے مولانا سید سلیمان ندوی شاعری میں وہ تخلص رمزی فرماتے تھے۔لیکن مجموعہ کلام ارمغان سلیمان کی ہر غزل تخلص رمزی سے خالی ہے۔(۲)

مولانا ندوی کو شبلیؒ جیسا استادفن ملا، نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد اردو، فارسی اور عربی زبانوں میں شاعری کے جوہر دکھانے لگے۔مشاعروں میں کلام سنایا تو تحسین کی صدائیں بلند ہوئیں۔رسالوں میں غزلیں چھپیں تو اہل نظر نے تعریف کے خطوط لکھے۔مولانا کی

ایک غزل جس کا مطلع ہے:

عجیب طرح کا ایک پیچ گفتگو میں ہے
وگرنہ ”میں“ میں وہی بات جو ”تو“ میں ہے

جب شاعر مشرق ڈاکٹر اقبال مرحوم کی نظر سے گزری تو انہوں نے لکھا:

”آپ کی غزل لاجواب ہے بالخصوص یہ شعر مجھے بڑا پسند آیا۔

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں
وہ ایک قطرۂ خوں جو رگ گلو میں ہے“

(۳)

سید سلیمان ندوی کے کلام میں تنوع ہے۔تصوف، مذہب، اسلامیات اور حق و معرفت کا گہرا رنگ غالب ہے۔(۴)

اشعار کا نمونہ پیش ہے ۔

☆ پا کر تجھے اپنے کو میں کیا بھول گیا ہوں — ہر سود و زیاں دوسرا میں بھول گیا ہوں
حل جب سے ہوا فلسفہ حسن حقیقت — ہر مسئلہ اے ذہن رسا بھول گیا ہوں
☆ مدرسہ چھوڑا خرابات میں آ کر بیٹھا — دوسرا سایہ دیوار کہاں سے لاؤں
☆ چل کھڑا ہو رہنما سے پوچھ کر راہ سفر — بحث میں الجھا مسافر تو سفر نا کام ہے
☆ کس نے بھر دی یہ صدائے دلنواز — ہر رگ جاں ساز الا اللہ ہے
☆ اب تو مے نوشی ہے عین شرع بر فتوائے شیخ — اب وہی ہو گا فقیہ شہر جو مے نوش ہے
☆ زاہد نے کہاں پائی زاہد نے کہاں پی لی — گفتار ہے رندانہ، رفتار ہے مستانہ
☆ دیدہ دل اگر ہو باز راز رہے نہ راز میں — جھانکتی ہیں حقیقتیں آئینہ مجاز میں
☆ تیرے میخواروں کے ساقی عجب انداز ہیں — دل سراپا جوش ہے لیکن زباں خاموش ہے

(۵)

علامہ ندوی کے کلام میں فکر بھی ہے اور فن بھی۔انہوں نے اردو شاعری کو ایک نیا

رنگ و آہنگ دیا۔یہی وجہ ہے کہ ان کی اشعار پر ہر طرف سے صدائے تحسین بلند ہوتی رہی ۔ان کے شعری مجموعہ ارمغان سلیمان سے چند غزلیں پیش ہیں ۔

دل حریف نگاہ یار کہاں سے لاؤں
جو نہ بے خود ہو وہ مختار کہاں سے لاؤں

نور ہی نور جدھر دیکھو نظر آتا ہے
تاب نظارۂ انوار کہاں سے لاؤں

اُف رے دریائے معاصی کی تلاطم خیزی
وہ سفینہ جو کرے پار کہاں سے لاؤں

قطرۂ اشک میں ہوں دل کے بھی ٹکڑے شامل
فطرت دیدۂ خونبار کہاں سے لاؤں

مدرسہ چھوڑ خرابات میں آکر بیٹھا
دوسرا سایہ دیوار کہاں سے لاؤں

جام پر جام مجھے دے کے بنادے بدمست
صبر سر جوشی اذکار کہاں سے لاؤں

(۶)

مولانا ندوی کے غزلیات کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک قادرالکلام اور روشن فکر شاعر تھے۔ ہر غزل سے پختہ فکری سنجیدہ نگاری اور بیدار مغزی عیاں ہے ۔کلام میں سلاست اور پاکیزگی پورے طور پر موجود ہے ۔اخلاقیات اور عرفان کو شعر کا قالب عطا کیا گیا ہے۔فنی نزاکت اور تخیل کی لطافت ہر جگہ ظاہر ہے ۔شعری ذوق اور فن شاعری میں کمال کا مظاہرہ بھی سامنے آتا ہے۔ان کی شاعری میں فکر ہی فکر ہے ۔ساتھ ہی تخیل کی فراوانی بھی ۔غزل کے اشعار ملاحظہ کیجئے

چاندنی چھٹکی ہوئی جس کی ہزاروں دل میں ہے
وہ فروغ نور عالم اس مہہ کامل میں ہے

لفظ بیگانہ بھلا کیا ترجمانی کرسکیں
شوق بے اندازہ پیچیدہ وہ میرے دل میں ہے

واکرائے مجنوں تو اپنے دیدۂ مشتاق کو
لیلی پردہ نشیں ہر پردۂ محمل میں ہے

جدو جہد دید میں ہے ذوق و شوق و لطف دید
حاصل ہر سعی میری سعی لاحاصل میں ہے

آہی جائے گا کبھی اس تک بھی ساقی جام دور
منتظر بیٹھا ہوا جو بھی تری محفل میں ہے

منزل مقصود ہے راہ طلب کا ہر قدم
وہ سر منزل ہے جو اب تک رہ منزل میں ہے

(۷)

مولانا ندوی نے اردو شاعری کو ایک نیا آہنگ دینے کی کوشش کی۔ان کے اشعار میں تیر بھی ہے اور نشتر بھی۔حسن وعشق کے روایتی موضوعات سے الگ ہو کر اردو غزل کو ایک نئے رنگ وآہنگ سے ہمکنار کرنے کی کوشش کی ہے۔ان کے لہجہ میں لطافت اور شائستگی ہے۔انسانی زندگی اور اس کے نشیب وفراز سے وہ پوری طرح واقف ہیں۔''میں'اور' تو'' کا فرق ان کی شاعری میں ایک نئے رنگ میں موجود ہے۔عشق حقیقی اور اخلاقیات کا درس ان کی شاعری میں پورے طور پر نمایاں ہے۔فصاحت وبلاغت،سلاست وروانی،جدت تخیل،ندرت خیال اور اظہار کی شائستگی مولانا ندوی کی غزل میں موجود ہے۔یہی وجہ ہے کہ شاعر مشرق علامہ اقبالؔ نے اپنے خط میں مولانا ندوی کے غزل کی تحسین کی ہے۔غزل ملاحظہ ہو ۔

عجیب طرح کا اک پیچ گفتگو میں ہے　　وگرنہ ''میں'' میں وہی بات ہے،جو''تو'' میں ہے
ہے کائنات کا ہر ایک ذرہ گردش میں　　پتہ جو مل نہ سکا تیری جستجو میں ہے
خطاب غیر میں گو لاکھ احترام رہے　　مگر وہ لطف کہاں ہے جو لفظ''تو'' میں ہے
دہن میں تیغ کے ابھی ہے تشنگی باقی　　عجیب لذت پنہاں مرے لہو میں ہے
نگاہ لطف ادھر ہو کہ آچلا ہے کیف　　بچا نہ رکھ میرے ساقی جو سبو میں ہے
ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں　　وہ ایک قطرۂ خوں جو رگ گلو میں ہے
قفس میں نالہ نہ کر مرغ صحن باغ سے دور　　کہ لطف شکوۂ یارانہ رو برو میں ہے

(۸)

دریائے نربدا کے متعلق انہوں نے اپنے جذبات کو نظم میں پیش کیا ہے۔جس کے بارے میں خود تحریر فرماتے ہیں۔''سفر کے اثناء میں جب میں بھروچ پہنچا،اور نربدا کے کنارے آکر کھڑا ہوا تو تخیل کی آنکھوں نے تیرہ سو چھتیس برس کی تصویریں نگاہوں کے سامنے کر دیں اور گو میں شاعر نہیں تاہم جذبات کے طلاطم نے موزون ترانہ کی شکل اختیار کر لی۔''مولانا کے اس نظم میں اسلامی تاریخ کا ایک باب پنہاں ہے۔مولانا کی یہ نظم اسی طرح رواں ہے جس طرح دریائے نربدا۔اس نظم میں سلاست ، روانی اور جذبات کی

فراوانی پورے طور پر موجود ہے۔ان اشعار کو پڑھ کر مولانا ندوی کے قادر الکلامی کا پتہ چلتا ہے۔ساتھ ہی یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے باضابطہ شاعری نہیں کی ،لیکن جو کچھ بھی کہا وہ اردو شاعری میں ایک قابل فخر سرمایہ ہے۔دریائے نربدا پر نظم ملاحظہ کیجئے ؂

نربدا اے نربدا! اے جادۂ بحر عرب — گرچہ تو ہندی ہے لیکن زادہ بحر عرب
جانتا ہے تو مری تاریخ کا پوشیدہ راز — تیرے دروازہ پہ ٹھہرا تھا مرا پہلا جہاز
تو گزشتہ کاروانوں کا نشان راہ ہے — ہند میں اسلام کی تاریخ سے آگاہ ہے
رشتہ ہند وعرب تجھ سے ہوا تھا استوار — تیرے ساحل کا ہر اک ذرہ ہے اس کی یادگار
ہند میں اسلام کے انجام کا آغاز تو — چار صدیوں تک رہا اسلام کا دمساز تو
آج کس کو یاد ہے وہ داستان پاستاں — تیرے ساحل پہ جب اترا تھا عرب کا کارواں
تو ہے دریائی پری یا شاہد عالم ہے تو — اس سمندر کے گلے کی شہ رگ اعظم ہے تو
تیرا ہر قطرہ حیات نو کا اک سرشار جام — اس تن آبی میں تیرا خون دوڑانا ہے کام
اے بھروچ!اے خاتم انگشت رود نربدا — عہد ماضی کی تری عزت رہے باقی سدا
تو بتائے چشم ظاہر آج تری خاک ہے — ذرہ ذرہ پرتو خورشید ذی لولاک ہے
یادگار عہد خیر القرن ہے تیری زمیں — مطلع انوار ذی النورین ہے تیری جبیں
چشم عبرت کی نگاہیں جب تری جانب اٹھیں — تیری موجیں کتنا انسانوں کی سطریں بن گئیں

(۹)

جنوری ۱۹۴۹ء کو بھوپال میں محفل شعر وسخن بڑے پیمانہ پر منعقد ہوئی ،اس میں جوش ملیح آبادی بھی مدعو کیے گئے ،انہوں نے اپنی نظم کو تاریخی غلطیوں سے مدلل کر کے وجود باری تعالی کے عقیدہ کا مذاق اڑایا۔یہ نظم دوسرے روز ۳۱؍جنوری ۱۹۴۵ء کو مقامی اخبار ندیم میں چھپی ،وہ یہ ہے ؂

ہفوات جوش

جبکہ بچے خواب کے ہنگام تھے گرم خروش — باپ کی صرف ایک "ہوں" نے کر دیا سب کو خموش

"ہوں" بزرگ خانداں کی آہنی دیوار ہے
بہر فساد و غلغلہ کا ایک "ہوں" ہی درکار ہے

سنتے ہیں انساں کا ہے باپ رب کائنات
اس لئے اے دوست تجھ سے پوچھتا ہوں میں یہ بات

جب ہلاکو نے بہائی تھیں لہو کی ندیاں
کوئی "ہوں" اس وقت کیا گونجی تھی زیر آسماں؟

تحفۂ آئے تھے جب مقتول انسانوں کے سر
پھٹ پڑی تھی کیا کوئی "ہوں" خیمہ چنگیز پر؟

شعلہ ہائے حکم نیرو جبکہ تھے بھڑکے ہوئے
ڈانٹ کی کوئی صدا آئی تھی بام عرش سے؟

لے اڑا تھا جبکہ راون ایک دیوتا کا "گھر"
کوئی "ہوں" گرجی تھی کیا اس وقت اوج چرخ پر؟

جب بپا تھا کربلا کی خاک پر دریائے خوں
دہر پر نازل ہوئی تھی کوئی ہیبت ناک "ہوں"؟

کر رہا تھا زہر جب سقراط کے دل پر اثر
عرش سے اتری تھی "ہوں" کوئی بساط فرش پر؟

عیسیٰ مریم کو جب کھینچا گیا تھا دار پر
ہو گئی تھی کیا کسی "ہوں" سے زمیں زیر و زبر؟

آئیٹم نے دیا تھا بھون کر جب ایک شہر
قلزم تنبیہ میں آئی تھی کیا اس وقت لہر؟

ہستیاں غلطاں تھیں جب موت کے گرداب میں
کوئی "ہوں" کڑکی تھی کیا ہنگامہ پنجاب پر؟

جب ہوئے تھے آخری اوتار گاندھی جی ہلاک
آئی تھی کوئی ندائے خشمگیں و قہرناک؟

اتنی چپ سادھے ہوئے ہے کس لئے عرش بریں
کیوں ہمارا آسمانی باپ 'ہوں' کرتا نہیں؟

(۱۰)

اس ملحدانہ نظم کا جواب مولانا سید سلیمان ندوی نے نظم میں دیا، جو ندیم میں ۲رفروری ۱۹۴۹ء کو چھپا۔ یہ نظم جوشؔ کے انداز پر ہے اور جوشؔ سے بہتر شاعری ہے۔ جس میں فنی محاسن بھی ہیں اور سنجیدہ افکار بھی۔ اس نظم کو پڑھنے کے بعد جوشؔ کی شاعری پھیکی نظر آتی ہے۔ نظم ملاحظہ ہو۔

باپ کی "ہوں" سے سنبھل جاتے ہیں فرزند سعید
ناخلف جو ہیں نہیں سنتے ہیں تہدید و وعید

تازیانہ غافلوں کو فتنۂ چنگیز تھا
راہوار نظم ملت کے لئے مہمیز تھا

نسل سے چنگیز کی سلطان دیں پیدا ہوا
ظلمت تاتار سے نور مبیں پیدا ہوا

ظلم نیرو سے کھلیں آنکھیں عوام روم کی
ہل گئی بنیاد اس کی عظمت موہوم کی

راون بدکیش، ظلم و جور کا فرماں روا
ہند کے دیو کا جو ''گوہر'' اڑا کر لے گیا

اس سے جو ہر کھل گیا سیتا کے پاک اخلاق کا
رام کی عزم بلند و شہرہ آفاق کا

کربلا کی خاک سے اٹھا تھا جو سیل رواں
ظلم پیشہ بادشاہوں کو بہار کر لے گیا

جو پیالہ زہر کا سقراط پی کر مرگیا
عقل کے وہ تا ابد جینے کا ساماں کر گیا

عیسیٰ مریم کی مظلومی کا یہ اعجاز دیکھ
روم کے ظالم ہوئے یوں حق سے سرفراز دیکھ

آئیٹم بم سے ہوا جو شہر کل ویران دیکھ
چین کی آہوں کا شرارہ اندروں جاپان دیکھ

خرمن پنجاب و بنگالہ پہ جو بجلی گری
اس سے جل کر خاک ہے سامان فرقہ پروری

کشتۂ بیداد گاندھی کے بدن کا سرد خوں
ہے زبان فطرت خاموش کی خاموش ''ہوں''

جاگ اٹھی اس ''ہوں'' کے پیہم شور سے خوابیدہ روح
رو پڑی چشم ستمگر ہنس پڑی غمدیدہ روح

بے بصر کو کیا خبر! ہوتا رہا ہے بار بار
تیرگی سے ''نور'' شر سے ''خیر'' یونہی آشکار

(۱۱)

سید صاحب نے جہاں علمی خدمات انجام دیئے، وہیں اس دور کی تمام قومی سیاسی تحریکوں میں ان کا نمایاں حصہ رہا ہے۔ اس زمانہ میں تین ترقی پسند سیاسی جماعتیں تھیں، کانگریس، خلافت کمیٹی اور جمعیۃ علماء ہند سید صاحب ان تینوں کے کاموں میں حصہ لیتے تھے۔ خلافت اور جمعیۃ علماء ہند کے تو سرگرم رکن تھے، اور ان کے جملہ مہمات امور میں ان کا مشورہ شریک رہتا تھا۔ کانگریس کے اہم جلسوں میں بھی شرکت کرتے تھے۔ اور اس کی ورکنگ کمیٹی کے رکن تھے۔

اس لئے ہندوستان کے سیاسی بیداری کے بعد اس کی آزادی کی جدوجہد کے لئے نومبر ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ علماء ہند کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے بانیوں میں مولانا سید سلیمان ندوی بھی تھے۔

جمعیۃ علماء ہند نے تحریک آزادی میں جو رول ادا کیا۔ وہ تاریخ کا اہم باب ہے۔
۲۸ر دسمبر ۱۹۹۱ء کو امرتسر میں جمعیۃ علماء ہند کا پہلا اجلاس ہوا، اس کی صدارت مولانا عبد

الباری فرنگی محلی نے کی۔ اس اجلاس میں حضرت شیخ الہند اور ان کے رفقاء کار اور مولانا ابوالکلام آزاد کے جیل سے رہا نہ کیے جانے پر اضطراب اور بے چینی کا اظہار کیا تھا۔

۱۹ر جولائی ۱۹۲۰ء کو حضرت شیخ الہند نے ترک موالات کا فتوی دیا۔ اس فتوی کی روشنی میں اور اس کی بنیاد پر خلافت کمیٹی اور کانگریس کے رہنما اور اکابرین برطانوی سامراجی حکومت کے مقابلہ میں صف آراء ہو گئے۔

جمعیۃ علماء ہند کا ساتواں اجلاس حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کی صدارت میں ہوا۔ جس میں سب سے پہلے مکمل آزادی کی تجویز منظور کی گئی۔

۱۹۲۰ء کے آخر میں ترک موالات کی تحریک شروع ہوگئی تھی، اس میں سرکاری تعلیم گاہوں کا بائکاٹ اور سرکاری امداد کی واپسی بھی تھی۔ ندوہ کو بھی پانچ سو ماہوار ایڈ ملتی تھی۔ اس لئے اس کی واپسی کا بھی سوال اٹھا۔ ندوہ کی مجلس انتظامیہ کے بہت سے ارکان اور اس کے رکن میں مولانا حبیب الرحمن خان شیروانی سرے سے ترک مولانات ہی کے خلاف تھے۔ اس لئے ایڈ کی واپسی کے مسئلہ میں سخت اختلاف تھا۔ مگر سید صاحب کی کوشش سے بڑے بحث ومباحثہ کے بعد مجلس انتظامیہ نے ایڈ کی واپسی کا فیصلہ کیا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی انتظامیہ نے ایڈ لینا بند کر دیا۔

مولانا سید سلیمان ندوی کو کانگریس کے اجلاس کی ورکنگ کمیٹی کا ممبر بھی منتخب کیا گیا۔ یہ انتخاب ۱۹۲۱ء میں کانگریس کے اجلاس احمد آباد گجرات میں ہوا۔ سید صاحب اس میں شریک ہوئے تھے۔ اور آپ کو ورکنگ کمیٹی کا ممبر منتخب کیا گیا۔

دسمبر ۱۹۱۹ء میں کانگریس اور خلافت کمیٹی دونوں کے اجلاس امرتسر میں ہوئے۔ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی بھی امرتسر پہنچے۔ خلافت عثمانیہ کے خاتمہ نے مسلمانوں کو بے چین کر رکھا تھا۔ جلیان والا باغ کے واقعہ نے ہندو اور مسلمان دونوں کو برہم کر دیا۔ اس طرح دونوں واقعات نے ہندو اور مسلمان دونوں میں اتحاد کا موقع فراہم کر دیا۔ اس طرح خلافت کمیٹی اور کانگریس دونوں میں اشتراک اور وزن پیدا ہوا۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے ملک ہی میں جدوجہد آزادی کو تیز کرنے کی ترغیب دلائی۔اور جمعیۃ علماء ہند کے پلیٹ فارم سے اس کے لئے کوشش کرتے رہے۔آخر ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سبھوں کے اشتراک سے آزادی کی تحریک شروع ہوئی۔اس طرح سبھوں کی مشترکہ کوشش سے ملک کو آزاد کرانے میں کامیابی حاصل ہوئی۔(۱۲)

۲۲ر نومبر ۱۹۵۳ کو کراچی میں آپ کا انتقال ہوگیا۔اور احاطہ قبور اسلامیہ کالج کراچی میں مدفون ہوئے۔

مراجع

(۱) حیات سلیمان، پرانے چراغ صفحہ ۱۹، تذکرہ علمائے بہار جلد ا ص ۶۳

(۲) بہار میں اردو کی نعتیہ شاعری ص ۳۸۳

(۳) مکتوبات اقبال نامہ حصہ اول ص ۳۴، ارمغان سلیمان ص ۵

(۴) بہار میں اردو کی نعتیہ شاعری ص ۳۸۳

(۵) مسلم شعراء بہار جلد دوم ص ۱۶۲

(۶) ارمغان سلیمان ص ۱۰

(۷) ارمغان سلیمان ص ۱۲

(۸) ارمغان سلیمان ص ۴۷

(۹) رسالہ معارف جمادی الثانی ص ۱۳۵۵ ہجری، مسلم شعرائے بہار جلد دوم ص ۱۶۴

(۱۰) مسلم شعرائے بہار جلد دوم ص ۱۶۵

(۱۱) مسلم شعرائے بہار جلد دوم ص ۱۶۶

(۱۲) حیات سلیمان مختلف صفحات

سرزمین بہار شریف اور علاقہ مگدھ کی تاریخی اہمیت

(علامہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ کی عملی زندگی کے پس منظر میں)

پروفیسر احمد سجاد

محترم بزرگو، دوستو اور عزیزو!

ہم سب ممنون ہیں کہ مولانا طلحہ نعمت ندوی اور ان کے معاونین نے نابغۂ عصر حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی یاد کے بہانے ہم سب کو ایک عرصہ کے بعد سرزمین بہار کے علاقہ مگدھ کے قلب بہار شریف میں جمع ہونے کا سنہری موقع عنایت فرمایا۔

حضرات! اس خطہ نے عالمی پیمانے پر بالخصوص اپنے وطن عزیز ہندوستان میں جو تاریخی رول ادا کیا ہے اس کی یاد کو تازہ کر کے ہم اس سمینار کو رسمی ادبی نشست کے بجائے علامہ سید سلیمان ندویؒ کے شایان شان ایک رجحان ساز نشست میں بدلنے کی کوشش کریں۔

اہل نظر خوب واقف ہیں کہ عہد قدیم سے شہر بہار شریف کے آس پاس نالندہ، راجگیر، بودھ گیا، شیخ پورہ، دیسنہ، اسلام پور، منیر شریف، حسین آباد ہر عہد میں علم اور اخلاق کے بڑے مراکز رہے ہیں۔ مہابھارت اور رامائن میں راجگیر کے راجہ جراسندھ کے تذکرے ہیں۔ مہاتما بدھ نے بودھ گیا میں نروان حاصل کی اور نالندہ میں اپنے وقت کی ایک عالمی یونیورسٹی تھی جس کا دوبارہ احیا کیا جا رہا ہے۔ جنرل کننگھم کی تحقیق یہ ہے کہ مونگیر اور شیخ پورہ ہزاروں برس قبل سے تہذیبی اہمیت کے مقامات رہے ہیں۔ چنانچہ ساتویں صدی عیسوی میں چینی سیاح ہیون سانگ پاٹلی پترا کے بعد شیخ پورہ بھی آیا تھا کیونکہ اس زمانے میں یہاں بودھ کا ایک ایسا استوپا تھا جہاں مہاتما بدھ نے ایک شب تبلیغ مذہب کا

کام کیا تھا۔اس کے علاوہ اس عہد میں یہاں بعض ایسے مندر بھی تھے جن کا تعمیری حسن اور نقش ونگار قابل دید تھے، بودھوں کا ایک عالمی اجتماع بھی راجگیر کی وادی میں منعقد ہوا تھا۔عصر حاضر کے ممتاز عالم اور محقق مولانا مناظر احسن گیلانی کا قول ہے کہ:

''بھارت کے علمی وفکری اور تمدنی وتہذیبی عروج کی ابتدا مگدھ دیش سے شروع ہوتی ہے''۔

بہار کی سب سے قدیم راجدھانی راجگیر ہی کو مرکز بنا کر مگدھ کے راجہ بمبی سار اور اس کے بیٹے اجات شترو نے چھٹی صدی قبل مسیح میں مگدھ شہنشاہیت کی بنیاد رکھی تھی۔ مہاتما بودھ راجگیر میں برسوں رہے اور دھیان کیا۔ بودھ مذہب کی پہلی سنگتی یا مجلس مشاورت راجگیر ہی میں سپت پرنی کی گپھا میں منعقد ہوئی تھی جس میں بودھ مذہب کے اصولوں کو مرتب کیا گیا تھا۔مہاتما بودھ نے سچائی، عدم تشدد، آفاقی امن و بھائی چارہ پر بطور خاص زور دیا۔ ان کا نظریہ برہما ویہار کے چار اجزائے ترکیبی مشہور ہیں: خیر، رحمدلی، مسرت اور مساوات جو برہمنزم کے اصولوں کے بالکل برخلاف ''بدھا، شرنم، گچھاں'' مشہور زمانہ قول ہے۔ یہاں ہندو، بودھ، جین کے بعد مسلم صوفیائے کرام کی ریاضتوں نے اس مقام کی اہمیت کو بڑھا دیا۔بختیار خلجی نے ۹۸۔۱۱۹۷ء میں بہار کو فتح کیا اور بہار شریف کو اس علاقہ کا دارالسلطنت بنا دیا۔حضرت شاہ ولی اللہ لکھتے ہیں کہ ''بلدہ بہار مجمع علما تھا''۔ شیر شاہ نے ۱۵۴۱ء میں دارالسلطنت بہار شریف سے پٹنہ منتقل کیا۔

ادبیات بہار کے ماہرین میں پروفیسر اختر اورینوی، پروفیسر شاہ مقبول احمد، ڈاکٹر کلیم عاجز، ڈاکٹر رفعت آرا اور ڈاکٹر شبر امام وغیرہم کے خیال میں ''ادبی قدامت'' کے اعتبار سے منیر شریف اور بہار شریف کو عظیم آباد پٹنہ پر بھی فوقیت حاصل ہے۔ کیونکہ ان مقامات میں مومن عارف، حضرت امام محمد تاج فقیہ اور مخدوم الملک نے مقامی بولیوں کے امتزاج سے کلام شروع کر دیا تھا، حضرت مخدوم الملک بھاشا کی شاعری میں شرف تخلص کیا کرتے تھے۔ حضرت موصوف کی خانقاہ بہار شریف اور حضرت مخدوم شعیب کی خانقاہ شیخ پورہ صدیوں سے دینی و

روحانی تبلیغ وتزکیہ کے علاوہ علمی وادبی مراکز کی حیثیت سے بھی معروف رہی ہیں۔ مسلم عہد میں حضرت مخدوم شعیب (۶۸۸ھ تا ۸۲۴ھ) بانی شہر شیخ پورہ ومصنف ''مناقب الاصفیا'' کے بعد یہاں صوفیا وعلما کا ایک سلسلہ ہی قائم ہوگیا۔ اسی عہد میں حضرت مخدوم الملک کے چچازاد بھائی حضرت مخدوم احمد چرم پوش کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

حضرت مخدوم الملک کے بارے میں علماء کی تحقیق یہ ہے کہ موصوف نے ہندوستان میں علم حدیث کے فروغ میں کلیدی رول ادا کیا ہے۔ پھر افغانوں کے عہد میں بہار شریف کی مرکزیت اور میر قاسم کے عہد میں مونگیر کی مرکزیت نے ان مقامات کو تہذیبی اعتبار سے کچھ اور مہمیز کیا۔ ان روحانی وسیاسی عوامل نے بہار کے گوشے گوشے میں علم وعرفان کے چھوٹے بڑے مراکز کا ایک جال سا پھیلا دیا۔ چنانچہ کوردہ دیہاتوں سے ایسے ایسے علما وشعرا اور مشاہیر اٹھے جنہوں نے بادشاہوں اور شہزادوں کی معلمی اور اتالیقی کی خدمات انجام دیں۔ سلطان قطب الدین ایبک کے زمانے میں راجہ اندردون نے موضع اورین کے لوگوں پر ظلم و ستم ڈھانا شروع کیا تو سلطان نے مولانا نورالدین کے ہمراہ دس ہزار سپاہ اور ان کی معیت میں حضرت سید احمد جاجنری کو بھی روانہ کیا۔ شاہ صاحب موصوف نے علاقہ شیخ پورہ کے موضع ''اکساری'' میں سکونت اختیار کرلی اور علاقہ بارہ گانواں (جس کا ایک گاؤں پچنہ بھی ہے) کو خصوصیت کے ساتھ اپنی تبلیغی مساعی کا مرکز بنایا۔ سید احمد جاجنری بلوری، مخدوم شعیب، سید شاہ غوث (مقبرہ برونی)، سید شاہ باعث (مقبرہ پچنہ) اور شمس الدین حقانی بلوری (جد اعلیٰ سیدنا محمد منعم پاکؒ) کی نسلیں بارہ گانواں میں خصوصیت کے ساتھ آباد ہوئیں۔ ان روحانی بزرگوں کے علاوہ علم وادب کے میدان میں جو تاریخی شخصیات اس علاقے میں پیدا ہوئیں ذیل میں محض ان کے نام گنانے پر اکتفا کیا جارہا ہے۔

نواب علی ابراہیم خاں خلیل (متوفی ۱۲۰۸ھ) شیخ پورہ ضلع مونگیر کے رہنے والے یہ نواب میر قاسم علی خاں عالی جاہ کے وزیر اور کچھ دنوں تک عظیم آباد کے صوبدار اور نائب ناظم رہے۔ عہد لارڈ ہسٹنگز میں ضلع بنارس کی عدالت دیوان کے حاکم اعلیٰ اور عہد لارڈ کارنوالس میں وہاں کے

کورز بھی رہے۔ کچھ دنوں مرشد آباد میں بھی تھے۔ صاحب تصنیف بزرگ گزرے ہیں۔

''گلزار ابراہیم'' (فارسی) شعرائے ریختہ کا مشہور تذکرہ ہے۔ ابتدا ۱۱۸۴ھ اور تکمیل ۱۱۹۸ھ (مطابق ۱۷۸۴ء) انجمن ترقی اردو نے اسے شائع کیا۔

اس کے علاوہ ''صحف ابراہیم'' (فارسی)، ''خلاصۃ الکلام'' (فارسی شعرا کا تذکرہ)۔ وقائع جنگ مرہٹہ، ایک رسالہ اور کچھ خطوط (مخزونہ برٹش میوزیم لائبریری) یادگار ہیں۔

نواب سید محمد علی خاں انجم، شاگرد غالب، معاصر و محب خصوصی شاد عظیم آبادی، شیخ پورہ کے مہمان نواز، صوفی منش اور سادہ مزاج بزرگ تھے۔ ان کے کلام کے دو مجموعے شائع ہوئے۔

حکیم محمد ہاشم بہاری۔ ۱۲ر جمادی الاول ۱۲۸۱ھ میں حسین آباد میں پیدا ہوئے مگر عمر کا بیشتر حصہ شیخ پورہ میں گزرا۔ پیشہ طبابت تھا۔ ان کا غیر مطبوعہ اردو دیوان محفوظ ہے۔ ڈاکٹر کلیم عاجز نے مندرجہ ذیل تصانیف کی نشان دہی کی ہے:

(۱) سکرات: (دو جلدوں میں) بہار کی عصری تاریخ (۲) بہار ماتم، مجموعہ مضامین (۳) عینک: دینی کتاب (۴) کلیات: نظم وغزل اور رباعیات پر مشتمل۔

ان کی ایک رباعی ملاحظہ ہو:

موت آئے گی مرجائیں گے ڈر کیا ہے — ہے اس کی خوشی یہی تو کرنا کیا ہے

اب تک نہ ہوئی جس کی حقیقت معلوم — وہ بھید تو کھل جائے گا مرنا کیا ہے

سید نثار حسین شعیبی (لندنی): پٹنہ میں جدید تعلیم کے حصول میں مشغول تھے مگر انگریزی سے کچھ ایسے برگشتہ ہوئے کہ اسے چھوڑ کر عربی پڑھنے لگے۔ والد نے رنجیدہ ہو کر ان کے اخراجات بند کر دیے تو بھاگ کر بمبئی چلے گئے تو وہاں تھیٹر کا ذوق ہو گیا۔ اتفاقاً وہاں سے لندن چلے گئے تو لندنی بھی لکھنے لگے۔

مہدی حسن مہدی: ۱۹۱۹ء میں پیدا ہوئے۔ ڈی، ایم، اسکول شیخ پورہ میں انگریزی کے استاذ رہے۔ موصوف ایک قادر الکلام شاعر اور شیخ پورہ کی علمی و ادبی زندگی کی جیتی جاگتی انسائیکلو پیڈیا تھے۔ موصوف سے ۱۹۷۴ء میں راقم الحروف کی ان کے در دولت

پر ایک تفصیلی ملاقات بھی ہوئی تھی جس کا حوالہ ذکر رفتگاں (ص ۳۳۲) میں موجود ہے۔

اک تہلکہ ہے عالم بالا میں آج پھر — شاید کہ آہ باب اثر تک پہنچ گئی
منزل لحد کی آگئی ٹھہرو مسافرو — عمر رواں مقام سفر تک پہنچ گئی

دیسنہ کہنے کو ۱۹۴۷ء سے پہلے ایک گاؤں تھا مگر علمی و ادبی اور تحقیقی نقطہ نظر سے بعض بڑے بڑے شہروں پر بھاری تھا۔ جہاں کی لائبریری خدا بخش خاں لائبریری پٹنہ کے بعد ''دوسرا بڑا مشرقی کتب خانہ'' کے نام سے موسوم تھی۔ جسے درجنوں مشاہیر ہند نے دیکھ کر تعریف و توصیف کی، آج بھی اس قیمتی سرمائے کو خدا بخش خاں لائبریری کے دیسنہ سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔ دیسنہ کی اہم ترین شخصیات میں علامہ سید سلیمان ندوی کے علاوہ پروفیسر نجیب اشرف ندوی، مولانا ابوظفر ندوی، صباح الدین عبدالرحمن اور پروفیسر عبدالقوی دسنوی وغیرہ کے علاوہ سید علی امام، حسن امام، سر سلطان احمد کے قانونی کارنامے علمی دنیا میں انمٹ ہیں۔

اسی خطہ کے شجر سایہ دار کے متعدد میٹھے پھل اور علم و ادب کے میدان میں بیرون ہند میں فیض رسانی میں مشہور زمانہ ہیں علامہ سید سلیمان ندویؒ کے خلف جناب مولانا ڈاکٹر سید سلمان ندوی۔

بہار شریف کے اس خطہ میں اسلام پور، دیسنہ، شیخ پورہ، حسین آباد وغیرہ میں ہندو مسلم، شیعہ سنی، وہابی، اہل حدیث، ترقی پسند، جدیدیت پسند، تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی، خاکسار تحریک، کانگریس، جمعیۃ العلماء، خلافت تحریک کے ہر جگہ گہرے اثرات نے یہاں کی علمی و ادبی، سیاسی و سماجی زندگی کو نکھار اور سنوار دیا تھا۔ قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے عملی نمونے تقسیم ملک کے قبل تک قابل دید تھے۔ علاقے کا ماحول شعر و سخن اس قدر بالیدہ ہو چکا تھا کہ نواب غلام رضا خاں، زمیندار ساکن شیخ پورہ کا ایک ان پڑھ ملازم سید ناصر حسین ناصر اور ان کے بھائی سید ماجد حسین ماجد بھی مشق سخن کیا کرتے تھے اور اچھے خاصے اشعار کہہ لیا کرتے تھے، ناصر کو پینے کی بھی عادت تھی، ان کے دو اشعار ملاحظہ ہوں۔

بادل کی طرح چھائے ہوئے بیٹھے ہیں میکش — لٹ جانے پہ بھی رونق میخانہ وہی ہے

ناصر کو جو دیکھا تو اسی حال میں دیکھا ٹوٹی ہوئی بوتل وہی پیمانہ وہی ہے

نواب وزیر حسن خاں وزیر (المتوفی ۱۹۴۷) موضع مانے شیخ پورہ سے دو میل مشرق کے رہنے والے، بڑے پرگو، بذلہ سنج اور قادرالکلام شاعر تھے تاریخ گوئی اور فی البدیہہ گوئی میں اپنی مثال آپ تھے۔ ایک صاحب مسمی علی کریم جو سودی کاروبار کرتے تھے، تعمیر مسجد کی خوش خبری لے کر نواب صاحب کے پاس آئے اور قطعہ تاریخ کہنے کی فرمائش کی تو موصوف نے برجستہ یہ تاریخ کہی:

بنانے والا صلہ پائے گا بنانے کا یقیں نہیں ہے کہ ''بے سود'' ہو یہ خیر کا کام
لکھی وزیرؔ نے تاریخ حسب فرمائش علی کریم کی ہے یادگار ''بیت حرام''

علی کریم کے سودی کاروبار کی مناسبت سے یہاں ''بے سود'' اور ''بیت حرام'' کے الفاظ قابل غور ہیں (ماخوذ از ذکر رفتگاں، شبر امام۔ ص ۳۳۷)

ضرورت اس امر کی ہے کہ بہار شریف اور اس خطے کی علمی و روحانی اور سیاسی و سماجی زندگی کی خوشگواری کو دوبارہ واپس لانے کی سعی کی جائے، پچھلی نصف صدی کے مقابلے میں حالات بعض مشکلات کے باوجود اب سازگار ہو رہے ہیں۔ اسی سرزمین بہار شریف میں آج سے ۳۵۔۴۰ سال قبل (۱۹۷۹ میں) انجمن ترقی اردو بہار کے زیر اہتمام آل بہار اردو کانفرنس کے اجلاس میں پورے ملک میں پہلی بار اردو کو دوسری سرکاری زبان کی حیثیت کا اعلان عام کیا گیا اور ۱۹۸۰ء سے اردو کو اس کا دستوری و قانونی حق اصولی طور پر حاصل ہوا۔ اور سماجی و سیاسی بیداری کی نشاۃ ثانیہ کا کام مسلم آبادی بخوبی کر سکتی ہے۔ بشرطیکہ وہ احساس کمتری و مایوسی اور غفلت و کاہلی کے خول سے باہر نکل کے قرآن و انبیائی اسوہ پر اپنی نئی نسل کو کارکرد بنائے۔

اس سلسلے میں زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ اپنے ہی دیار کے علامہ سید سلیمان ندوی کی زندگی اور عمل کو نمونہ بنائیے۔ علامہ علیہ الرحمہ پچھلی صدی کے سب سے بڑے سیرت نگار ہی نہیں تھے بلکہ حضورؐ کے اسوہ پر حتی الوسع عمر بھر عمل بھی کرتے رہے۔ دنیا جانتی ہے کہ علامہ کے دور شباب میں تین ترقی پسند سیاسی جماعتیں تھیں: کانگریس، خلافت

کمیٹی اور جمعیۃ العلماء ہند۔ سید صاحب ان تینوں کے کاموں میں حصہ لیتے تھے۔ خلافت کمیٹی اور جمعیۃ العلماء ہند کے سرگرم رکن ہی نہیں اس کی ورکنگ کمیٹی کے ایک باوقار رکن بھی تھے۔ ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ علماء ہند کا قیام عمل میں آیا تو سید صاحب اس کے بانیوں میں بھی تھے۔ جمعیۃ علماء ہند کے ساتویں سالانہ اجلاس کے سید صاحب صدر منتخب کیے گئے تھے جس میں سب سے پہلے مکمل آزادی کی تجویز منظور کی گئی ۱۹۲۰ء میں جب ترک موالات کی تحریک شروع ہوئی تو ندوہ کو پانچ سو روپے ماہوار ملنے والی ایڈ کی واپسی کا مسئلہ بے حد نازک تھا کیونکہ اس سے مالی بحران کے خطرہ کے علاوہ ندوہ کی مجلس انتظامیہ کے بہت سے ارکان بشمول مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی سرے سے ترک موالات ہی کے مخالف تھے مگر سید صاحب کی کوشش سے بڑے بحث ومباحثہ کے بعد مجلس انتظامیہ نے ایڈ کی واپسی کا فیصلہ کیا اور سید صاحب نے پھر اس مالی بحران پر قابو پانے کے بڑے جتن بھی کیے۔ دسمبر ۱۹۲۰ء میں ناگپور میں کانگریس کے تاریخی اجلاس جس میں نان کوآپریشن کی تصدیق کی گئی سید صاحب نے اس اجلاس میں شرکت کی تھی۔ دارالمصنفین سید صاحب کے زمانے میں بڑے بڑے لیڈران کا مرکزِ ثقل بنا ہوا تھا۔ مولانا محمد علی، شوکت علی، ڈاکٹر انصاری، پنڈت جواہر لال نہرو، مسز سروجنی نائیڈو سب کی میزبانی کا شرف دارالمصنفین کو حاصل تھا۔ ۱۹۲۱ء میں کانگریس کے اجلاس احمد آباد (گجرات) میں سید صاحب شریک تھے، جہاں کانگریس ورکنگ کمیٹی کے دس ممبروں میں ایک نام سید صاحب کا بھی تھا۔ بالفاظ سید صاحب "بالآخر بلاتوقع یہ عزت میرے حصہ میں آئی"۔

کانگریس اور خلافت کمیٹی کے اتحاد نے ہندو اور مسلمان کو قریب تر کرنے میں اہم رول ادا کیا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں رولٹ ایکٹ کا نفاذ، گاندھی جی کا اس کے خلاف ستیہ گرہ اور ۱۳/اپریل کو جلیان والا بدنام زمانہ واقعہ اور خلافت عثمانیہ کی معزولی نے پورے ملک میں غم و غصہ کی ایک آگ سی لگادی تھی۔

اسی زمانے میں خلافت کمیٹی کا ایک وفد ۱۹۲۰ء میں لندن اور فرانس بھیجا گیا جس

کے ایک معزز رکن سید صاحب بھی تھے۔سید صاحب ہندوستان کی آئینی آزادی میں کوشش کو صرف دنیاوی مسئلہ نہیں بلکہ دینی فرض اور مذہبی حق سمجھتے تھے، نیز ہندوستان کی آزادی کو تمام مسلم ممالک کی آزادی کا ذریعہ سمجھتے تھے۔سچ تو یہ ہے کہ علامہ شبلی ،مولانا آزاداور علامہ سید سلیمان ندوی کی ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی اتحاد و بھائی چارہ کی اسپرٹ کے پیش نظر اگر تقسیم ملک کے بجائے متحدہ ہندوستان کو آزادی نصیب ہوئی ہوتی تو آج تک برصغیر کا نہ صرف نقشہ دوسرا ہوتا،اتحاد وہم آہنگی، امن وسلامتی اور خوشحالی ہوتی بلکہ تاریخ عالم میں ورلڈ سوپر پاور کوئی دوسرا نہیں بھارت ہوتا۔

غرض سید صاحب کے علمی وعملی کارنامے آج اور آنے والے دور کے لیے بھی ایک آئیڈیل نمونہ سے کم نہیں۔

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز   یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لیے

(اقبال)

علامہ سید سلیمان ندوی کی علمی خدمات کا مختصر جائزہ

ڈاکٹر سید ارشد اسلم

خوشی کی بات ہے کہ جہاں ہم لوگ بیٹھے ہیں یہاں سے محض ۱۵ کیلومیٹر کی دوری پر دسنہ گاؤں آباد ہے۔ یہ گاؤں شروع سے ہی بڑا زرخیز رہا ہے یہاں بڑے بڑے صوفیاء، بزرگان دین، شاعر وادیب اور دوسرے علوم وفنون کے ماہرین پیدا ہو چکے ہیں۔ چنانچہ علامہ سید سلیمان ندوی کا تعلق بھی اسی گاؤں سے تھا، وہ ۲۲ نومبر ۱۸۸۴ء کو دسنہ میں پیدا ہوئے، جو قدرت کی طرف سے غیر معمولی ذہن لے کر آئے تھے۔ علامہ سید اسلیمان ندوی کو اللہ تعالیٰ نے وہ جامعیت عطا فرمائی تھی کہ وہ بہت کم لوگوں کو ملتی ہے۔ تفسیر قرآن کے ماہر، دریائے حدیث کے شناور، دربار فقہ وقضا کے صدر نشیں، تاریخ وسوانح کے ماہر، اردو، فارسی اور عربی کے استاذ، شاعر و ادیب، زباں داں اور خطیب، وقت کی سیاست کے رمز شناس، ملت اسلامیہ کے غم گسار، تقوی و طہارت، حلم ومروت اور شرافت کے پیکر کیا نہ تھے سید سلیمان ندوی۔

علم و دین و حکمت و دانش کا ایسا اجتماع
جلوہ گر ہوتا ہے اک پیکر میں صدیوں میں کہیں

وسعت معلومات کا یہ عالم تھا کہ مستشرقین بھی آپ کا لوہا مانتے تھے، دنیا کے بڑے بڑے علماء وفضلا اور محققین آپ کے معتقد تھے۔

شروع شروع میں سید صاحب کے علمی تبحر ان کے حقیقی خدوخال اور ان کے دوررس اثرات معاصرین کی نگاہوں سے اوجھل تھے، لیکن اس کا احساس سب سے پہلے علامہ اقبال کو ہوا۔ جس طرح حضرت شاہ ولی اللہ کی عظمت کا احساس سب سے پہلے مظہر جان جاناں کو ہوا تھا، اسی علامہ سید سلیمان ندوی کے علمی تبحر، ان کے کارناموں کے عظیم الشان اثرات کا مشاہدہ

سب سے پہلے علامہ اقبال کی چشم جہاں بین نے کیا اور بے اختیار پکار اٹھے۔

''علوم اسلام کے جوئے شیر کا فرہاد آج ہندوستان میں سوائے سید سلیمان ندوی کے اور کون ہے''۔

یک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

سید صاحب ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے تھے اور ۱۹۵۳ء میں انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس مدت میں ہندوستان کے سیاسی حالات نے کیا کیا رنگ بدلے اور وقت کا قافلہ کن کن نازک مرحلوں سے گزرا لیکن تیشۂ فرہاد کبھی ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔ سید صاحب نے صرف اسلامیات ہی کو نہیں بلکہ اسلامی فکر و ثقافت کو اپنے مطالعہ کا موضوع بنایا اور ان سے متعلق علوم کی ہر شاخ کا نہ صرف گہرا مطالعہ کیا بلکہ جو کچھ انہوں نے لکھا اس سے ان کے مصادر کی اہمیت روشن ہوگئی۔ انہوں اردو، فارسی، عربی زبان و ادب کے علاوہ تاریخ اسلام و مسلمین، عربی تہذیب و تمدن اور اسلامی فلکیات و بحریات کا کوئی بھی گوشہ ادھورا اور تشنہ نہیں چھوڑا۔ انہوں نے نصف صدی تک ہندوستان اور عالم اسلام کو اپنے قلم کی روانی سے سیراب کیا اور اپنی شعلہ نفسیوں سے گرم اور اپنی نوا سنجیوں سے پرشور رکھا اور اپنی انتھک تحقیقی کاوش اور سحر انگیز قلم کی جادوگری سے خشک سوتوں کو اس طرح جگایا کہ اگر آپ کو ابن رشد کی تلاش ہو تو سیرت النبی جلد سوم دیکھیے، اگر ابن خلدون اور ابن تیمیہ کی تصویر دیکھنا چاہتے ہوں تو سیرت النبی جلد چہارم دیکھیے۔ ابن قیم کی تعلیمی موشگافیوں کا مطالعہ کرنا ہو تو سیرت النبی ﷺ جلد پنجم کو پڑھیے، غزالی اور رومی کے فلسفۂ اخلاق کی تلاش ہو تو سیرت النبی ﷺ کی جلد پنجم پڑھیے۔ سحر انگیز خطیب اور جامع صفات پیغمبر کا مطالعہ کرنا چاہتے ہوں تو خطبات مدراس پڑھیے۔ البیرونی و ابن بطوطہ کی سیر و سیاحت اور قدیم ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہتے ہوں تو عرب و ہند کے تعلقات پر ایک نظر ڈالیے۔ ایک بڑے عالم، حکیم و صوفی کو دیکھنا چاہتے ہوں تو خیام کا مطالعہ کیجیے۔

یہاں بدنام خیام رندو شاہد باز کے بجائے ایک بڑا عالم، حکیم وصوفی نظر آئے گا۔
ابن ماجد، واسکوڈی گاما کی سیاحت اور عربوں کی بحری ایجادات وانکشافات جاننا چاہتے ہوں تو عربوں کی جہاز رانی کا مطالعہ کیجیے۔

غرض علامہ سید سلیمان ندوی نے نصف صدی تک بے تکان لکھا، اور کتنے ہی موضوعات ایسے ہیں جن پر انہوں نے اردو کو قابل فخر ولائق اعتبار سرمایہ دیا ہے۔انہوں نے ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے جن کے بارے میں اردو زبان تہی دامن تھی لیکن ان موضوعات کا دامن ہمارے شب وروز سے جڑا ہوا تھا اور جن کو سمجھے بغیر ہم اپنے ماضی کی شاندار روایت سے اپنا رشتہ برقرار نہیں رکھ سکتے تھے۔غرض سید صاحب نے اپنی پوری زندگی علمی وادبی خدمات کی خاطر وقف کردی تھی۔مرحوم کی زندگی کا ہر لمحہ ملت کی زندگی کے لئے ایک نیا پیام لاتا تھا،انہوں نے میدان علم وادب میں جو بیش بہا گوہر لٹائے ہیں اسے رہتی دنیا تک فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ان کے علمی وادبی کارنامے تاریخ ساز اہمیت کے حامل ہیں۔

علامہ سید سلیمان ندوی کے ادبی نظریات

مولانا ڈاکٹر سید راشد نسیم ندوی

الرحمٰن علم القرآن، خلق الإنسان علمه البيان.

اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا آیات میں جہاں یہ واضح فرمایا کہ رحمٰن نے قرآن مجید کی نعمت عظمیٰ سے انسان کو نوازا، وہیں یہ حقیقت بھی نمایاں فرمادی کہ اظہار بیان کا ملکہ انسان کا طبع زاد نہیں بلکہ اس کی تعلیم بھی خود خدائے رحمان نے فرمادی ہے، یہ بیان کی صلاحیت ہی ہے جو بنی نوع انسان کو دیگر حیوانات ومخلوقات سے ممیز کرتی ہے۔ کیوں کہ اظہار بیانی محض قوت گویائی کا نام نہیں ہے بلکہ اس قوت ناطقہ کے لیے عقل وشعور، فہم وادراک اور قوت تحلیل وتجزیہ بھی درکار ہوتی ہے۔ پھر لفظ ''بیان'' صرف سادہ گفتگو کے لیے مخصوص نہیں جیسے کہ لفظ ''کلام'' کا مفہوم ہے، بلکہ بیان جچے تلے انداز میں اظہار مافی الضمیر کو کہتے ہیں۔ علامہ زمخشری نے اس لفظ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا: "هو المنطق الفصيح المعرب ما في الضمير"۔ چناں چہ اظہار بیان کے اسی قرینے وسلیقے کو ادب سے موسوم کیا گیا۔ لفظ ادب جتنا کثیر الاستعمال ہے اتنا ہی مجہول الادراک بھی ہے۔ مختلف ناقدوں اور ادب کے نمائندوں نے اس لفظ کی تشریح میں تفصیل وتطویل سے کام لیا۔

ادب کے معنی کی اصل دعا یعنی دعوت دینا ہے، اسی سے اس دعوت کو جس میں لوگ بلائے جائیں ''مدعاۃ'' اور ''مادبۃ'' کہتے ہیں اور حضرت ابن مسعودؓ سے منقول حدیث میں یہ لفظ آئے ہیں کہ: "إنّ هذا القرآن مأدبة من اللّٰه في الأرض فتعلموا من مأدبته" کہ یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے زمین پر دعوت ہے لہٰذا اسکی دعوت سے سیکھو۔ ادب کے لفظ کے لئے فیروزآبادی نے یہ لکھا ہے کہ "فهو الظرف وحسن

التنساول" یعنی شائستگی ہے اور مناسب طرز پر لینا ہے۔اور ابن منظور نے لسان العرب میں لکھا ہے کہ ''ادب وہ چیز ہے، جس کو لوگوں میں سے ادیب یعنی مؤدب آدمی اختیار کرتا ہے۔اس کو ادب اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو اچھی باتوں میں لگاتا ہے اور بری باتوں سے منع کرتا ہے، ادب کی تعریف امام عبدالقاہر جرجانی نے یہ کی ہے کہ ''ادب اس بات کو جاننے سے عبارت ہے جس کے ذریعہ ہر طرح کی غلطی سے بچا جائے خواہ وہ غلطی لفظی ہو یا معنوی،وہ کہتے ہیں:"الأدب عبارة عن معرفة ما یحترز به عن جمیع أنواع الخطاء لفظاً و کتابة" ابن ہذیل نے ''عین الادب'' میں لکھا ہے کہ ادب کی دو قسمیں ہیں،طبعی اور کسبی طبعی میں اخلاق حسنہ اور صفات محمودہ آتی ہے،اور کسبی میں وہ باتیں آتی ہیں جو مطالعہ وحفظ اور غور سے حاصل ہوتی ہیں۔

ابن السکیت نے ادب کی تعریف کرتے ہوئے لکھا کہ ''مما یعلق بالقلوب وتشتهیه الآذان" (جو دل میں جگہ بنا لینے کی صلاحیت رکھتا ہو اور جسے سننے کہنے کے لئے کان بے تاب رہتے ہوں۔)اور موجودہ دور میں ادب زیادہ تر اس تحریری سرمایہ کو کہتے ہیں جو اپنے اندر جاذبیت اور دل پذیری رکھتا ہو،اس کی دل آویزی مخاطب کو متاثر کر لے اور اس کا حسن و جمال قابل التفات ہو،ایسا سرمایہ (لٹریچر) ہر زبان میں ایک اہم مقام کا حامل ہوتا ہے،جس کا مطالعہ ہمہ وقت ہوتا ہے اور جس سے ناقد و مورخ صرف نظر نہیں کر پاتا، اس ذخیرہ کو ہم بآسانی دو اہم قسموں میں بانٹ سکتے ہیں۔وہ ذخیرہ جس میں ادب برائے ادب رہا،جس ادب کی کاوش اظہار مہارت اور خودنمائی وخودستائی کے سوا کچھ نہ ہو۔جب کہ ادب کی دوسری قسم اس بامقصد سرمائے سے عبارت ہوتی ہے جو زندگی کو اعلیٰ قدروں سے جوڑنا چاہتا ہے۔جو ادب برائے زندگی اور ادب برائے حیات ہوتا ہے،جس میں زندگی کے تقاضوں کی عکاسی بھی ہوتی ہے اور سماج کی تربیت کا جذبہ بھی،جس میں سچ کی پرچار بھی ہوتی ہے اور دروغ گوئی کا قلع قمع ہوتا ہے۔اُردو زبان میں بھی اس ادب کا سرمایہ وافر مقدار میں کتب خانوں کی زینت بنا ہوا ہے۔اس فہرست میں حالی وشبلی بھی نظر آئیں

گے اور اکبر و اقبال بھی، اسی فہرست میں پچھلی صدی کے نامور علماء و مورخین جیسے مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ، مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور مولانا ابوالحسن علی ندویؒ بھی نظر آتے ہیں۔ انہی اہل قلم و نظر مصنفین میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کا نام آفتاب عالم تاب کی طرح درخشاں و روشن نظر آتا ہے۔ ادب کے بارے میں سید صاحب کے نظریات پر گفتگو سے پہلے خود سید صاحب کی ادبی شخصیت کا جائزہ بے محل نہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے سید صاحب کو جن گوناگوں صلاحیتوں سے نوازا تھا انہی میں ان کی ترسیل و تفہیم کی بے پناہ صلاحیت ہے جو آپ کو ممتاز انشا پرداز بناتی ہے۔ نپی تلی بات دلآویز اسلوب میں پیش کرنا سید صاحب کا طرۂ امتیاز تھا۔ فصل الخطاب کا یہ ملکہ خداداد بھی ہوتا ہے اور ریاضت سے نکھرتا بھی ہے، سید صاحب کو علامہ شبلی نعمانیؒ جیسے نابغہ روزگار انشاپرداز کی صحبت نے خوب جلا بخشی تھی۔ آپ کی علمی کاوشوں پر ایک نگاہ ڈالنے سے جہاں موضوعات کی بوقلمونی اور رنگارنگی نظر آتی ہے وہیں وہ ادبی امتیاز بھی نظر آتا ہے جو بامقصد ادب کا عکس و نقش ہوتا ہے۔ حیات امام مالک، خواتین اسلام کی بہادری، ارض القرآن، سیرت عائشہ، عرب و ہند کے تعلقات، عربوں کی جہازرانی اور سیرت النبی کے پانچ حصے جہاں تاریخ و تحقیق کے ان مٹ نقوش ہیں وہیں ادب کے انمول شہ پارے بھی ہیں، خیام، نقوش سلیمانی، مقالات سلیمان اور حیات شبلی ادب عالیہ کا گنج گراں مایہ بھی ہیں اور سید صاحب کے ادبی نظریہ کی تفسیر بھی ہیں، پھر وہ ہزار ہا صفحات جو شذرات، وفیات اور مقالات کی شکل میں جانے جاتے ہیں وہ سب سید صاحب کے ادبی، علمی اور تحقیقی تشخص کے غماز ہیں۔ ان سب کا تحلیل و تجزیہ اور تفصیلی جائزہ دراصل ایک ریسرچ پراجکٹ کا متقاضی ہے جو موضوعاتی طور پر انجام دیا جائے۔ اس موقع پر اس حقیقت کا اعتراف بھی برمحل ہوگا کہ سید صاحب کی زندگی پر حیات سلیمان، تذکرہ سلیمان جیسی گراں قدر تصانیف بھی مہیا ہیں اور سید صاحب کے ادبی و علمی کارناموں پر ڈاکٹر سید ہاشم صاحب اور ڈاکٹر نعیم صدیقی صاحب کے رشحات قلم بھی زیور طبع سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔

اس مختصر مضمون میں چوں کہ سید صاحب کے اسلوب بیان اور انشا پردازی کو محور کلام نہیں بنانا ہے بلکہ آپ کے ادبی مشرب کو نمایاں کرنا اصل موضوع ہے، لہٰذا یہ حقیقت بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونی چاہیے کہ ہر انسان پر اس کے گرد وپیش و معاصر حالات کا اثر پڑتا ہے، ادیب چوں کہ زیادہ حساس و باشعور ہوتا ہے تو اس کا زمان و مکان سے متاثر ہونا حتمی ہوتا ہے۔ عرب اس نفس الامری کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ "المرا ابن بیئتہ" (انسان اپنے وقت و حالات کا رہین منت ہوتا ہے) اس قانون فطرت کی روشنی میں اگر ہم سید صاحب کی معاصر ادبی تحریکات پر طائرانہ نگاہ ڈال لیں تو پتہ چلے گا کہ بے شمار تحریکیں اٹھ رہی تھیں اور ان تحریکوں کے علمبردار بڑے زور و شور سے اپنے اپنے نظریات کی وکالت اور اس کا پرچار و تبلیغ کر رہے تھے، اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں (جو سید صاحب کی فکری تشکیل کا زمانہ سمجھا جا سکتا ہے) کلاسیکی تحریک عروج پر تھی۔ Neo Classes کے عنوان سے ادب کو جمال کا پیکر بنا کر اساطین ادب کی تقلید کی دعوت اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ ادب کے سابقہ شہ پاروں کو ادبی سرچشمہ مان کر ان سے تجاوز جرم سمجھا جانے لگا تھا، بسا اوقات ظاہری حسن پر توجہ ادب کو بے معنی و بے مقصد بنا دیتی ،اور فنی محاسن و لفظی زیبائش کلام کو مہمل و لغو کر دیتی تھی۔ اسی رد عمل میں رومانیت کی وہ تحریک اٹھی جس نے الفاظ سے زیادہ احساس کو اور تقلید کے بجائے تجدید کو اختیار کرنے کی دعوت دی۔ انفرادیت کی تلاش اور جذبات کے احترام میں یہ تحریک بھی اس قدر آگے بڑھ گئی کہ ایمائیت اور پھر مسوریالی جیسی فنی تحریکیں بھی وجود میں آئیں۔ نیز وجدانیت اور وجودیت جیسے پیچیدہ اور گنجلک قسم کے نظریات بھی جنم لینے لگے۔ ان حالات کا بدیہی نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ واقعیت کی تحریک نے اپنا علم بلند کیا جس کی معنوی شاخ اُردو ادب میں ترقی پسند تحریک کے نام سے منصۂ شہود پر آ گئی۔ یہ وہ ادبی نظریات تھے جو ادب کی دکان کو چمکانے میں لگے ہوئے تھے۔ جس کی کشمکش میں علمی و تحقیقی کارنامے دائرۂ ادب سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ اخلاقی و روحانی قدریں ادب کے حدود سے خارج کی جا چکی تھیں۔ اسی زمانے میں علامہ شبلیؔ ،مولانا

حالیؒ اور سرسیدؒ نے بامقصد ادب کی جوت روشن کی اور علامہ سید سلیمان ندویؒ جیسی شخصیتوں نے اس کو مزید جلا دی۔علامہ سید سلیمان ندویؒ نے ادب کو منزل مقصود نہیں سمجھا بلکہ اس کو محمل پر ہی محمول کیا جو منزل کے متلاشی کا سفر آسانی وخوشنما تو بنا دیتا ہے لیکن اس کے حوصلوں کی آرام گاہ نہیں ہوتا۔سید صاحب کا یہ نظریہ خود سید صاحبؒ کی تحریر میں دوٹوک اور واضح انداز میں نظر آتا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں:

''شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کے کبھی میرا مطمح نظر نہیں رہا، کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لیے وقت نہیں، مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو، اور بس، اس بات کو مدنظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں، کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں۔'' (معارف اکتوبر ۱۹۱۹ء)

اس اقتباس نے سید صاحبؒ کے اس نقطہ نظر کو واضح کر دیا جو شعر و ادب کے سلسلے میں انہوں نے اپنایا تھا۔یہی وہ نقش سلیمانی ہے جو آپ کی تمام تصانیف میں بھی نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔تمام تصانیف میں اسلوب اور طرز ادا کا خوبصورت انداز چمکتا ہوا نظر آتا ہے۔تاریخ کا خشک موضوع ہو یا سوانح نگاری کی ذمہ داری، قرآن وحدیث کے رموز ونکات، یا فقہی وکلامی مباحث، ان تمام موضوعات کو اس پیرایہ میں بیان کرتے کہ قاری کبھی اکتاہٹ اور بیگانگی محسوس نہ کرتا۔جملوں کے دروبست، الفاظ کا انتخاب، بندش کی پختگی آپ کی تحریر کو انشاپردازی کا شاہ کار بنا دیتی ہے۔خلاصہ کلام یہ کہ سید صاحب نے ادب کو صالح قدروں اور بلند افکار کے اظہار کا ذریعہ سمجھا اور اس کو سماج کی تربیت اور انسانیت کی شیرازہ بندی کا وسیلہ جانا اور عملی طور پر اس کو اپنی ساری کاوشوں میں برتا۔یہ وہ فکر ہے جو ادب اسلامی سے معنون ہے۔اور اس نظریے کو اسٹیج اور اس طرز ادا کو تحریک کی شکل اس وقت ملی جب مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے ساری دنیا کے ادباء کو دعوت فکر دی اور ان کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کے بعد رابطہ ادب اسلامی کی داغ بیل ڈالی، جو ادب موجودہ دنیا میں ایک تسلیم شدہ حقیقت بن کر عالمی لٹریچر میں جگہ پا چکا ہے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ اور فارسی زبان وادب

مولانا ڈاکٹر سید عبد احد ندوی

علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو اردو، عربی اور فارسی زبانوں پر یکساں قدرت تھی، اردو دنیا میں تو ان کی شخصیت بلا اختلاف مسلم ہے، عربی زبان وادب کے متعلق ان کی خدمات پر بھی کام ہو چکا ہے، لیکن ان کی فارسی دانی کے متعلق اب تک کوئی مضمون نظر سے نہیں گزرا، جب کہ فارسی میں ان کی کامل دستگاہ کی شہادت ان کے اس قصیدہ سے مل سکتی ہے جو انہوں نے اپنے دور طالب علمی (۱۹۰۵ء) میں علامہ شبلی کی ندوۃ العلماء آمد پر کہا تھا، یہ قصیدہ تقریباً ۱۲۷ اشعار پر مشتمل ہے جس کا مطلع ہے۔

بدہ ساقی مئے کو بفگند جلباب ظلمانی
خرد را نور بخشد از چراغ طور ایمانی

اس کے علاوہ بھی فارسی میں سید صاحب کی شاعری کے متعدد نمونے ملتے ہیں گر چہ اردو کے مقابلہ میں بہت ہی کم ہیں۔

فارسی نثر کا کوئی اہم نمونہ ہمارے سامنے نہیں، مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی ایک تحریر سے سید صاحب کی ایک فارسی کتاب کا علم ہوتا ہے لیکن وہ شاید اب موجود نہیں۔

مولانا گیلانی لکھتے ہیں "مجھے یاد آتا ہے، غالباً سید الملت نے خاکسار سے خود ہی تذکرہ فرمایا تھا کہ فارسی زبان میں اپنے مولد ومنشا دسنہ کی تاریخ مرتب فرما رہے ہیں، میں نہیں جانتا کہ فارسی زبان میں سید صاحب کی یہ کتاب پایۂ تکمیل کو پہنچی کہ نہیں، اردو اور عربی کے سوا فارسی میں سید صاحب کی دستگاہ کی شہادت یہی کتاب پیش کر سکتی ہے"۔ (ماہنامہ ریاض کراچی سلیمان نمبر)

ان کی فارسی دانی کا مظہر وہ خطوط بھی ہو سکتے تھے جو ایران و افغانستان کے فضلاء کے خطوط کے جواب میں لکھے گئے تھے، لیکن ان تک رسائی بھی اب ممکن نہیں ،صرف ایک نمونہ ذیل میں درج ہے۔ فارسی نثر کی معمولی جھلک سید صاحب کی کتاب خیام میں دیکھی جا سکتی ہے جس میں خیام کے ایک فارسی رسالہ کو مرتب کرتے ہوئے جا بجا حواشی اور کتاب کے آغاز میں ایک صفحہ کا مقدمہ ہے جس کی چند سطریں یہ ہیں

''اصل ایں نسخہ نسخہ ایست قدیمہ کہ در کتب خانہ متحف برطانیہ لندن است، و نسخہ آخر این رسالہ در کتب خانہ ملی بہ پاریس در مجموعہ روضۃ القلوب موجود است''۔

نیز ایک قلمی مکتوب بھی پیش خدمت ہے لیکن مکتوب الیہ کا صحیح علم نہیں ہوسکا۔

محبت یگانۂ من سلامت باکرامت باشند تحیت و تسلیم نیازمندانہ قبول فرمایند۔

ایں یکے از حسن مصادفات است کہ ازاں سو مکتوب گرامی بحرکت آمد، و ازاین سو نیاز نامۂ من بخدمت شما رواں شد۔ یادآوری را سپاس می گذارم، و این فرمودہ آید کہ بعد از سفر ایران مکتوب گرانمایہ فرستادہ اید، بندہ بیکے ازیں دو ہم نائل نشد ،استغفر اللہ کہ من سرکار شما را فراموش کنم و یاد آن عنایات صمیمانہ را از دل محو کنم۔

حقہ مہر بدون نام و نشان است کہ بود

پیغامیکہ بہ پروفیسور حمید اللہ فرستادہ (؟؟) بود ید رسید و کتاب خیام بخدمت گرامی ارسال کردہ شد، امید کہ رسیدہ باشد، اکنوں کتاب سیرت عائشہ ارسال می کنم۔ نسخۂ دیگر کتاب خیام بعقب ارسال خواہم کرد۔ چوں من در عنفوان شباب بودم، یکے مقالۂ من زیر طبع بود، ناچار صاحب مطبع منزعج (؟؟) شد، و گفت و چہ خوش گفت، اے مصنف تازہ! غم مخور کہ ہیچ مصنف را بزندگیش کتاب کامل و صحیح طبع نہ شد۔ برہمیں منوال می گویم کہ کتاب خیام پس از چندیں سال ناقص شد، و حاجت حک و اصلاح افتاد، چوں جناب شامی خواہید کہ عیب بندۂ خویش را بکشور دور و در عرفہ (؟؟؟) سراید می خواہیم کہ تا توانیم بر عیب خویش پردہ بیفگنیم، ان شاء اللہ نسخۂ مصححہ بنظر ثانی پس از اصلاح بخدمت گرامی شما ارسال کنم۔ حساب شما را بہ ترجمۂ این کتاب اجازت کلی حاصل است۔ نامہائے حکیم سنائی کہ بدریافت آن ہا شما موفق شدہ اید اہمیت بزرگ دارد بر جہان فارسی منت

بے اندازہ کردید، ذکر جمیل شما بزبان معارف خواہد آمد۔

والسلام

مخلص شما

سلیمان

اسی طرح اپنے جد بزرگوار حکیم سید محمدیؒ صاحب دسنوی کی کتاب ''نور محمدی'' مطبوعہ مطبع معارف کے اخیر میں سید صاحب کے قلم سے صاحب کتاب کے حالات اور کتاب پر اجمالی تبصرہ ہے، یہ بھی ان کی فارسی نثر کا ایک نمونہ ہے۔

لیکن اگر زبان دانی اور کسی زبان پر قدرت کی شہادت صرف اس کا تحریری سرمایہ نہیں بلکہ اس کی قوت فہم اور اس زبان کے اشعار کی تشریح و توضیح سے بھی ادا ہو سکتی ہے تو پھر اس کے نمونے سید صاحب کی تحریروں میں جا بجا ملیں گے، اس سلسلہ میں ان کی کتاب ''خیام'' کو بطور نمونہ پیش کیا جا سکتا ہے، اس کتاب میں خیام کی شاعری کی تشریح و تنقید سید صاحب نے جس دقت نظر سے کی ہے اور رباعی کی تعریف میں جس دیدہ وری کا ثبوت دیا ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے فارسی زبان میں ان کی کامل دستگاہ کا اندازہ لگانا مشکل نہیں، اور یہ حقیقت ہے کہ سخن وری سے زیادہ سخن شناسی اور سخن فہمی انسان کے ذوق و استعداد کی دلیل ہے۔ بہر حال سید صاحب کے کمالات کا یہ پہلو اب تک تشنہ ہے، ضرورت ہے کہ اس پر توجہ کی جائے۔

علامہ سید سلیمان ندوی اور عربی زبان وادب میں ان کی خدمات

مولانا ڈاکٹر محمد فرمان ندوی

علامہ سید سلیمان ندوی کی شخصیت جامع الکمالات تھی،خلاق ازل نے انہیں بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا،وہ ایک عظیم مفسر،ماہر محدث،زمانہ شناس فقیہ و متکلم باکمال سیرت نگار اور بقول علامہ اقبال "علوم اسلامیہ کے جوئے شیر کے فرہاد" تھے۔وہ اقلیم زبان وادب کے بے تاج بادشاہ تھے،اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے بقول "ان کی زندگی کا سب سے نمایاں اور ممتاز پہلو ان کی جامعیت اور ان کے علوم ومضامین کا تنوع ہے"۔ان کی زندگی کا ہر پہلو ایسا روشن اور تابناک ہے کہ دل کے اندر بے ساختہ یہ مصرعہ زبان پر آتا ہے:

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا این جاست

علامہ سید سلیمان ندوی کا عربی ذوق:

علامہ موصوف زبان وادب کے رمز اشناس تھے،وہ صرف مادری زبان اردو ہی کے ماہر نہیں تھے بلکہ عربی زبان کی سنگلاخ وادی کے بھی مسافر تھے،اگر چہ انہوں نے ابتدائی کتابیں دارالعلوم ندوۃ العلماء آنے سے پہلے پڑھ لی تھیں لیکن ۱۹۰۱ء میں دارالعلوم میں ان کے داخلہ کے ساتھ ہی باکمال اساتذہ کے فیض صحبت سے انہیں زبردست فائدہ ہوا۔ان میں مولانا فاروق چریا کوٹی،مولانا حفیظ اللہ اعظمی،مولانا الحکیم سید عبدالحی اور مولانا

علامہ شبلی نعمانی قابل ذکر ہیں، ۱۹۰۶ء میں دارالعلوم سے سند فراغت حاصل کی اور رفاہ عام کلب کے جلسہ میں عربی تقریر کر کے اپنی علمی عبقریت اور عربی دانی کا ثبوت فراہم کیا۔ یہ وہ پہلا نقش ہے جو سید صاحب کا شاندار مستقبل کا ضامن ہو۔ مولانا غلام محمد کراچی لکھتے ہیں:

ایک مرتبہ راقم کی موجودگی میں دو منکرین حدیث حضرت والا کی خدمت میں آئے اور اپنے مسلک کی گفتگو کا آغاز کیا، دعویٰ یہ کیا کہ قرآن ہمارے لئے کافی ہے اور آسان ہے اور تائید میں یہ آیت پڑھ دی۔ ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر۔ حضرت والا مخاطب کی لیاقت کو تاڑ گئے، دریافت کیا کہ آیا عربی سے واقفیت ہے، جواب اثبات میں ملا، تو فرمایا: اس آیت کا ترجمہ کر دیجئے، مخاطب نے مفہوم بیان کیا، حضرت والا نے فرمایا کہ میں نے ترجمہ پوچھا تھا، پھر فرمایا کہ خیر یہی بتا دیجئے کہ یہ لفظ ”مدکر“ کیا ہے اور اس کا مادہ کیا ہے؟ مسؤل نے فوراً کہا یہ لفظ ”درک“ سے بنا ہے اور اس کے معنی سمجھنے کے ہیں، حضرت والا نے فرمایا کہ مجھ کو اسی جواب کی توقع تھی، یہ آپ حضرات کی عربی دانی ہے، اور اس پر قرآن فہمی کا دعویٰ، پھر ان دونوں کو حضرت نے نہایت شفقت سے سمجھایا کہ یہ لفظ ذکر سے مشتق ہے، اور فلاں قاعدہ کے تحت ”د“ ”ذ“ سے بدل گئی ہے، اس کے بعد نصیحت فرمائی کہ پہلے عربی زبان پھر متعلقہ علوم قرآن کے حصول کی طرف توجہ کی جائے، اور پھر قرآن پاک پر غور و خوض کریں، اس گفتگو سے بظاہر وہ دونوں حضرات متاثر اور پشیمان بلکہ ممنون ہو گئے“۔ (تذکرہ سلیمان ص ۲۸۴)

اس سے معلوم ہوا کہ سید صاحب کی عربی زبان و ادب پر گرفت بڑی مضبوط تھی، عربی زبان و ادب میں کمال ولیاقت کا اثر تھا کہ وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ۱۹۰۸ء میں عربی کے استاد ہو گئے، اور ۱۹۱۳ء تک اسی عہدے پر فائز رہے، اسی دوران عربی زبان کی ایک معجم بھی تیار کی جو ”لغات جدیدہ“ کے نام سے متعارف ہے، اور ”دروس الادب“ کے نام سے عربی زبان سیکھنے کے لئے دو ریڈرس تیار کی، اور عربی زبان و ادب کے ماہرین تیار کرنے میں زبردست حصہ لیا۔ انہوں نے عربی اداریئے لکھے، نظمیں کہیں، یہاں تک کہ

ایک دیوان بھی تیار ہو گیا، اور عربی کتابوں پر مقدمے تحریر کئے، عربی وفود کی ترجمانی بھی کی ،اور ہندوستان کی نمائندگی بھی۔

ذیل میں کچھ اہم ادبی کاوشوں کا تذکرہ کیا جا رہا ہے:

دروس الادب:

علامہ سید سلیمان ندویؒ کا بحیثیت استاد ادب عربی ۱۹۰۸ء میں تقرر ہوا تو انہوں نے علامہ شبلیؒ کے مشورہ سے ''دروس الادب'' نامی کتاب دو حصوں میں تصنیف کی، یہ کتاب ابتدائی عربی سیکھنے کے لئے لکھی گئی ہے، حصہ اول ۳۲ صفحات پر مشتمل ہے، اور نحوی قواعد کی روشنی میں عام فہم مثالیں دی گئی ہیں۔ حصہ دوم ۶۰ صفحات پر مشتمل ہے، اس میں دو باب ہے، ایک باب جملوں اور فقروں کے استعمال پر مشتمل ہے، اور دوسرا باب مکالمات پر۔
اس کتاب کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ اس میں قرآنی آیات، احادیث اور تاریخی واقعات کا کثرت سے استعمال کیا گیا ہے۔

لغات جدیدہ:

یہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کی ایک مشہور کتاب ہے، ۱۹۱۰ میں ندوۃ العلماء کے سالانہ جلسہ منعقدہ دہلی میں عربی کے جدید الفاظ کی ایک ڈکشنری مرتب کرنے کی تجویز پیش کی گئی، چنانچہ سید صاحب نے محنت کر کے ۱۹۱۲ میں پیش کیا، اس وقت ندوۃ العلماء لکھنو میں علامہ رشید رضا مصری تشریف فرما تھے، انہوں نے بے حد پسند کیا، اور اس کی تحریف وتوصیف کی۔

اس کتاب میں عربی کے چار ہزار الفاظ کی تشریح کی ہے، اس میں دخیل اور مولد الفاظ پر بھی ایک جامع ابتدائیہ تحریر کیا ہے۔اس کتاب کی اشاعت سے پہلے ۱۹۱۲ میں مطبع آسی لکھنو سے ہوئی۔مولانا مجیب اللہ ندویؒ نے لکھا ہے: ''جدید عربی ادب میں جب مغربی افکار وخیالات اور جدید انکشافات کی وجہ سے برابر نئے الفاظ اور نئی ترکیبیں داخل ہو رہی تھیں تو سید صاحب کو اس کتاب کے دوسرے اور تیسرے ایڈیشن کے وقت اس کتاب میں

ترمیم واضافہ کا خیال ہوا، اس کے لئے انہوں نے اپنے محبوب شاگرد مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم کو منتخب کیا اور ان کی اصلاح کے بعد یہ کتاب دوبارہ سہ بارہ شائع ہوئی"۔(معارف سلیمان نمبر ۱۹۵۵ء)

عربی مقالہ نگاری:

علامہ سید سلیمان ندویؒ طالب علمی کے زمانے سے اردو عربی میں مقالات لکھتے تھے، وہ مقالات عربی اور اردو جرائد میں شائع ہوتے تھے، ان میں الضیاء، البیان اور المنار خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

البیان میں شائع ہونے والے اہم مقالات میں المجلس النیابی العثمانی، علم الکلام والتوحیدواصحاب الحدیث، خطب النساء المسلمات فی الحروب، اعجاز القرآن، المسیحیة والاسلام، الشعر العربی، المدنیة الاسلامیة والمدنیة الحدیثة، المولد النبوي والمحتفل الاول به، عالم الاسلام واحتیاجهم الی العلوم الحدیثة۔

الضیاء میں "طلوع الضیاء" کے نام سے افتتاحیہ سپرد قلم کیا، "علم الجغرافیۃ" کے عنوان سے چھ قسطوں میں مقالہ لکھا۔

عربی مقدمے:

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے کئی کتابوں پر عربی میں مقدمے لکھے۔ ان میں:

(۱) ملتقط جامع التنزیل لمحکم التاویل (مرتبہ مولانا سعید انصاری)

(۲) امعان فی اقسام القرآن (لعبدالحمید الفراهی)

(۳) فاتحة تفسیر نظام القرآن لعبدالحمیدالفراهی

(۴) کتاب المعتبرللفلسفی المشهورابی البرکات هبة الله البغدادی (مطبوعہ تینوں جلدوں میں دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد)

(۵) الرد علی المنطقیین لابن تیمیہ (مطبوعۃ الدار القیمہ ممبئی باہتمام شیخ عبدالصمد شرف الدین الکتبی)

(۶) معجم الامکنۃ للحاج معین الدین الندوی۔

عربی میں خطوط نگاری:

مولانا مسعود عالم ندویؒ نے علامہ سید سلیمان ندویؒ کے خطوط کو "مکاتب سلیمان" کے نام سے جمع کیا ہے، یہ خطوط اردو میں ہیں، لیکن ابتدائیہ پانچ خطوط عربی میں ہیں مولانا مسعود عالم ندویؒ لکھتے ہیں:

"پہلے پانچ خطوط عربی میں ہے، اس وقت راقم کو نیا عربی کا شوق تھا، درس نظامی کی اکثر متداول کتابیں پڑھنے کے باوجود عربی زبان لکھنا اور بولنے کی قدرت نہ رکھنے کا بڑا افسوس تھا، خانگی حالات بھی سال دو سال سے بہت خراب تھے، باہر جانا چاہتا تھا، مگر پر پرواز نہیں، بار بار کلیجہ مسوس کر رہ جاتا کہ کیا کیا جائے، اتنے میں سید صاحب قبلہ سے مراسلت کی سوجھی، جس کا پہلا ثمرہ دارالعلوم ندوہ میں داخلہ کی شکل میں ظاہر ہوا، اور کامیابی کی راہ نمودار ہوئی"۔

اسی طرح سید صاحب کی پانچ خطوط مجلۃ المجمع العربی الھندی کے میمنی نمبر میں ہیں، جو انہوں نے علامہ عبدالعزیز میمنی کو لکھے تھے۔اسی طرح سید صاحب نے پروفیسر براؤن اور پروفیسر مارگولیتھ کو اس وقت لکھا، جب ترکی میں خلافت کے امکانات پیدا ہو گئے تھے، اور ایک وفد لندن مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں اور سید صاحب کی مذہبی رہنمائی میں بھیجا گیا تھا، برید فرنگ میں سید صاحب نے لکھا ہے:

"یہاں مستشرقین میں براؤن ہمارے ساتھ ہیں، اور مارگولیتھ ہمارے مخالف، براؤن صاحب کو چار صفحہ کا عربی میں حالات حاضرہ پر خط لکھا ہے، اور ان سے تائید چاہی ہے، اپنی کتابیں بھیجی ہیں، دیگر مستشرقین سے بھی اس مسئلہ میں خط و کتابت کا ارادہ ہے۔(برید فرنگ: ۳۹)

عربی شاعری:

علامہ سید سلیمان ندویؒ اردو نثر نگاری کے ساتھ عربی شاعری میں بھی کمال اور قدرت رکھتے تھے، اللہ تعالی نے انہیں صاف ستھرا ذوق عطا فرمایا تھا، وہ برجستہ شاعری کرتے تھے۔ان کی شاعری کے اہم موضوعات جو الضیاء میں شائع ہوئے ہیں وہ مرجع ہیں۔

انین الاسلام فی الھند،تھنئةلصحة الاستاذ شبلی النعمانی،یا مسلمی الھند،المسرة ماھی،الشمس فی الشفق عند مغیبھااورحب الوطن۔

سید صاحب کی شعری خصوصیات کے سلسلے میں حضرت مولانا رابع حسنی ندوی مدظلہ کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''سید صاحب کو صرف نثر ہی نہیں، بلکہ شاعری سے بھی دلچسپی تھی، انہوں نے مختلف موضوعات پر شعر کہے ہیں، ان کی شاعری لطافت شعور، حسن تخیل کے ساتھ مکارم اخلاق اور علوم و معارف کا گنجینہ ہے، اس میں لطافت واثر، حسن ورعنائی اور سادگی و پرکاری کا حسین امتزاج ہے، حالانکہ اتنے سہل اور فطری انداز میں شعر کہنا ایک ایسے شخص کے لئے جس کی نشو ونما عربی ماحول میں نہ ہوئی ہو اور نہ اس کو اہل ازبان کی صحبت میں رہنے کا موقع ملا ہو انتہائی مشکل کام ہے، جس میں شاذ و نادر ہی کسی کو کامیابی ملتی ہے، لیکن بسا اوقات ممتاز و با کمال اہل قلم کی نگارشات عالیہ اور ان کے ادبی شہ پاروں کا مطالعہ اس کا بدل بن جاتا ہے، اور دراصل اس سے سید صاحب کے ادبی ذوق اور سلیقہ کی تشکیل ہوئی ہے''۔(مطالعہ سلیمانی، ص۳۸۲)

سید محمد ہاشم ''سید سلیمان ندوی'' (ص ۳۷۰) میں رقم طراز ہیں: ''سید صاحب کے قیام پاکستان کے زمانہ میں ایک دوست سفیر شام متعینہ پاکستان عمر بہاء الامیری سید صاحب سے ان کا عربی کلام یہ کہہ کر لے گئے تھے کہ وہ اس مجموعہ کو شائع کریں گے، غالباً اس کو نوبت نہ آسکی، اور اس طرح ان کا کل عربی کلام نایاب ہے، بہر حال یہاں اس سلسلہ میں شاہ معین الدین صاحب کے قول پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ سید صاحب عربی ممتاز ادیب

اور قادر الکلام شاعر تھے“۔

یہ ایک اجمالی تذکرہ ہے سید صاحب کی عربی زبان وادب میں خدمات کا۔
خلاصہ یہ کہ علامہ سید سلیمان ندوی کا عربی زبان ادب کے فروغ میں زبردست حصہ ہے، انہوں نے عصر جدید کے اسلوب ونثر کے مطابق اپنی نثر وشاعری کو ترقی دی، اللہ تعالی نے انہیں دردمند دل عطا فرمایا تھا، اس کے اثر سے غیر معمولی قوت پیدا ہوتی تھی۔ ضرورت ہے کہ سید صاحب کے نظریات پر مستقل کام کیا جائے، اور وہ جہات تلاش کی جائیں جوان کے پیش نظر تھیں۔

سلطنتِ ادب وتحقیق کا سلیمان: سید سلیمان ندوی

(نقوشِ سلیمانی کے حوالے سے)

مولانا فاروق اعظم قاسمی

علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم ایک مایہ ناز عالمِ دین، اسلامی تاریخ کے ماہر اور زبان وادب کے محقق وناقد ہیں۔ان کا اصل میدان تو اسلامی تاریخ ہے اور اردو ادب سے ان کا تعلق ثانوی ہے۔تاہم اس باب میں بھی ان کا نام بڑی عظمت سے لیا جاتا ہے۔

اس وقت سید صاحب کی نہ سوانح مرتب کرنا مقصود ہے اور نہ ہی ان کی جملہ علمی و ادبی جہات پر گفتگو۔بر دست ان کی ایک معروف کتاب ''نقوشِ سلیمانی'' کا ایک نئے سرے سے مطالعہ کرنے کی ادنیٰ کوشش کی جارہی ہے۔دراصل ان کی یہ کتاب مختلف مواقع پر ان کے پیش کردہ خطبات، چند وقیع مقالات اور گیارہ کتابوں پر تحریر کردہ مقدمات و دیباچوں کا مجموعہ بڑی تقطیع کے ۴۷۲ صفحات پر مشتمل ایک قیمتی دستاویز ہے۔پہلی بار یہ کتاب دارالمصنفین کے زیرِ اہتمام ۱۹۳۹ء میں اعظم گڑھ سے شائع ہوئی۔اس وقت اس کا چوتھا ایڈیشن (۱۹۹۳ء) میرے روبرو ہے۔اس کتاب میں علم وتحقیق اور ادب وتنقید کے نو بہ نو پھول اپنی بوقلمونیوں سے اہلِ علم وادب کی سیرابی و آسودگی فراہم کرنے میں گزشتہ اسی برسوں سے مصروفِ کار ہیں۔

اس نقطے پر تو تمام اربابِ نظر متفق نظر آتے ہیں کہ علامہ سید سلیمان ندوی اسلامی علوم کے ماہر اور اس کے اسرار ورموز سے واقف وباخبر تھے۔یہی وجہ ہے کہ شبلی جیسی تاریخ ساز ہستی کی شاگردی نصیب ہوئی، پھر بعد میں یہی شاگرد شبلی کے علوم ومعارف کا حقیقی

وارث وامین بھی ٹھہرا۔ شبلی ۱۹۱۴ء میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے لیکن سید صاحب نے نومبر ۱۹۱۴ء کو دارالمصنفین اعظم گڑھ کی بنیاد ڈالی اور جولائی ۱۹۱۶ء میں ماہنامہ ''معارف'' کے اجرا کی شکل میں اپنے استاذ کے دیرینہ خواب کو شرمندۂ تعبیر کیا جس کا شاندار سلسلہ اب ایک صدی عبور کرنے کو ہے۔ علامہ شبلی کا ایک عظیم خواب ''سیرت النبی'' کی تکمیل بھی ہے۔ اس کے علاوہ سیرتِ عائشہؓ، حیاتِ شبلی، حیاتِ امام مالک، خیام، تاریخ ارض القرآن، اور ایک معروف اسکول ٹیکسٹ بک رحمتِ عالم وغیرہ ندوی صاحب کی علمی، تحقیقی اور تاریخی قدر آوری کی زندہ تصویریں ہیں۔

نقوشِ سلیمانی کا شہرہ اس لیے بھی ہے کہ اردو زبان کے آغاز کے سلسلے میں سید صاحب کا جو ''نظریۂ سندھ'' ہے، اس کا انکشاف پہلی بار اسی کتاب کے ذریعے ہوا۔ سید صاحب اپنے اس دعویٰ کے پیچھے مضبوط دلائل بھی رکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں: ''مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچتے ہیں، اس لیے قرینِ قیاس یہی ہے کہ جس کو ہم آج اردو کہتے ہیں اس کا ہیولیٰ اسی وادیٔ سندھ میں تیار ہوا ہوگا''۔ (نقوشِ سلیمانی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ (۱۹۹۳ء) چوتھا ایڈیشن، ص: ۳۱)

یہ الگ بحث ہے کہ اس باب میں ان کے اس نظریے کو زیادہ اعتبار حاصل نہیں ہے لیکن سرے سے اس نظریے کو مسترد کرنا بھی آسان نہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر کا خیال ہے: ''اردو زبان کے آغاز اور ابتدائی نشو ونما سے وابستہ مباحث کے لحاظ سے بیشتر ماہرینِ لسانیات میں اسے کسی خاص خطے سے مشروط کرنے کا رجحان قوی تر نظر آتا ہے۔ چناں چہ پنجاب، دکن، اور سندھ کو اردو کی جنم بھومی ثابت کرنے کے لیے جو نظریات پیش کیے گئے انہیں خصوصی شہرت حاصل ہے بلکہ بیشتر لسانی مباحث بھی انہی نظریات کی ضمنی پیداوار قرار پاتے ہیں''۔ (اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی (۲۰۱۳ء) دوسرا ایڈیشن، ص: ۶۳-۶۴)

عرب وہند کے تعلقات بھی چوں کہ سید صاحب کا موضوع رہا ہے اور اس سلسلے میں ان کی ایک مستقل کتاب ''عرب وہند کے تعلقات'' بھی ہے۔ اس لیے وہ اپنے 'نظریۂ

سندھ کی دلیل یوں پیش کرتے ہیں: ''ایک ایسا ملک جو مختلف نسلوں، مختلف قوموں، مختلف زبانوں کا مجموعہ تھا، ناگزیر ہے کہ وہاں باہمی میل جول کے بعد ایک زبان پیدا ہو۔ وہ پیدا ہوئی اور اسی کا نام اردو ہے''۔ (نقوش، ص:۵)

سید صاحب کا خیال ہے کہ اردو کا نام اردو بھی غلط ہے۔ فرماتے ہیں: ''ہندوستان کی اس مشترک زبان کو اردو کہنا، میں اصطلاح کی غلطی سمجھتا ہوں۔ اردو کے ابتدائی مصنفین نے اس کو ہمیشہ ہندی کہا ہے اور انگریزوں کی زبان میں اب تک اس کا نام ''ہندوستانی'' ہے''۔ (نقوش، ص:۷) اسی کی وضاحت کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں کہ اس زبان کا نام ''اردو'' تیرہویں صدی کے اوائل کی بات ہے یعنی آج سے تقریباً ڈھائی سو سال پہلے کا یہ نام ہے''۔

۱۸۶۷ء سے اردو ہندی کا تنازع شروع ہوا۔ یہ دراصل اردو ہندی کا جھگڑا نہیں تھا بلکہ انگریزوں کی خاص پالیسی ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کا جذبۂ سیاہ اس کے پس پردہ کار فرما تھا۔ اس کے لیے گوروں نے برادرانِ وطن کا خوب استعمال کیا۔ اس طرح انگریز اپنے مشن میں کامیاب بھی ہوئے اور ہندوستان کی صدیوں پرانی تہذیب پر شب خون بھی مارا اور دو قوموں کے بیچ کبھی ختم نہ ہونے والی جنگ کی مضبوط بنیاد بھی ڈال دی۔ گوروں کی اس دوغلی پالیسی سے سید صاحب بہت نالاں تھے۔ یہی وجہ کہ وہ اس بات پر بہت مصر نظر آتے ہیں کہ ہندوستان کی مشترکہ زبان کا نام اردو غلط ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جس طرح عرب کی زبان عربی، چین کی زبان چینی، جاپان کی جاپانی اور روس کی زبان روسی کہلاتی ہے اسی طرح ہندوستان کی اس مشترکہ زبان کا نام بھی ہندوستانی ہونا چاہیے۔ ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں: ''ایک شائستہ اور مہذب زبان کا خاصہ ہے کہ اس کے نام لینے کے ساتھ وہ قوم یا ملک سننے والے کی سمجھ میں آجائے۔ ...لفظِ اردو سے اس قسم کی کوئی مدد ذہنِ انسانی کو نہیں ملتی اس لیے اس کی جگہ اس کے اصلی نام ''ہندوستانی'' کو رواج دینا چاہیے''۔ (نقوش، ص:۱۰۵)

انھوں نے اس سلسلے میں اہلِ وطن کے سامنے بڑی قیمتی تجاویز بھی رکھیں

اورانھیں نظر انداز کرنے کی صورت میں اس کے خطرناک انجام سے بھی آگاہ کیا۔سید صاحب اس ہندوستانی کے قائل تھے جس کا رسمِ خط فارسی تھا لیکن وہ اس بات کے سخت مخالف تھے کہ اس پیاری اور شیریں وسبک زبان کو عربی و فارسی اور سنسکرت کے بھاری بھرکم الفاظ سے بوجھل کردیا جائے۔ ''ہماری زبان بیسویں صدی میں'' میں سید صاحب نے پورے ملک میں اردو زبان کی وسعت وترقی ،مختلف تحریکوں کے زیراثر اردو زبان وادب کے قائم ہونے والے نئے نئے جزیروں ، اردو کی جامعات اور اداروں، اردو کو عالمگیر حیثیت عطا کرنے میں دینی مدارس کے کرداروں اور مختلف اردو اخبارات ورسائل کے اجرا کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔اخیر میں مختلف موضوعات پر مشتمل اردو کی مطبوعہ کتابوں کی ایک طویل فہرست بھی درج کی گئی ہے۔

ایسے ہی مشمولہ ''ہماری زبان'' میں بھی اردو کو قومی زبان کا درجہ دینے کی سید صاحب نے پرزور وکالت کی ہے۔یہ مضمون درحقیقت اردو ہندی تنازع کے سلسلے میں اردو کے خلاف اٹھائے گئے چند سوالات کا جواب ہے جس میں سید صاحب نے بڑی دردمندی کے ساتھ اس خدشے کا اظہار کیا ہے کہ اگر اس مشترکہ وراثت ''ہندوستانی'' کو نظرانداز کیا گیا تو ملک کے ہزار سالہ تہذیب وتمدن کا بیڑا غرق ہو جائے گا۔یہاں سید مرحوم چند فرقہ پرست ذہنیت کے حامل لوگوں کے منفی رویوں سے مایوس بھی نظر آتے ہیں لیکن ساتھ ہی کچھ سیکولر رجحان رکھنے والے اہلِ وطن کی سنجیدگی سے پرامید بھی دکھائی دیتے ہیں۔

سید صاحب کے خطبات کی روشنی میں اردو زبان کے تئیں ان کے احساسات و نظریات کے ذکر کے بعد اب ان کی تحقیق وتنقید کی طرف قلم کا رخ موڑا جاتا ہے۔سید صاحب نے اپنے تحقیقی مقالات اور تقریظ ومقدمے میں جو ادبی گفتگو یا آراء پیش کی ہیں، انہی تحریروں کے تناظر میں ان کے تحقیقی وتنقیدی مقام ومرتبے کو متعین کرنے کی سعی جائے گی۔

مقالات کے ضمن میں پندرہ مضامین شاملِ کتاب ہیں۔ان میں بیشتر مضامین کا رنگ تحقیقی ہے۔ان کے خطبات کا رنگِ تحقیق بھی خاصا شوخ ہے لیکن خطبات کے مقابلے

میں مقالات زیادہ مفصل اور مدلل ہیں۔متذکرہ مقالات میں ''اکبر کا ظریفانہ کلام''، ''ہاشم علی کا مجموعۂ مراثی'' کے سوا بقیہ کا تعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ تحقیق ہی سے ہے، بطورِ خاص ''بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق'' (بالاقساط) ''تمہید'' اور ''جواہرالاسرار میں کبیر کی بات چیت''۔ان مقالات میں ''انڈیا آفس لائبریری میں اردو کا خزانہ'' کو سفرِ انگلینڈ کا اور ''سفرِ گجرات کی چند یادگاریں'' کو سفرِ گجرات کا رپورتاژ کہنا چاہیے۔

''انجمن اردوئے معلٰی کے چند سوالوں کا جواب'' اور ''زبانِ اردو کی ترقی کا مسئلہ''۔ اردو ہندی تنازع کے تصفیے اور اردو کو قومی زبان کا مقام دینے کے سلسلے میں رشید احمد صدیقی نے مختلف اصحابِ نظر اور دانشوران سے چند سوالات کیے تھے۔سوالنامہ سید صاحب کے پاس بھی آیا تھا۔اول الذکر انہی سوالات کے جواب پر مشتمل مضمون ہے۔کسی بھی زبان کی ترقی کے حوالے سے پروفیسر براؤن (مستشرق) نے چند معروضات پیش کیے تھے۔ان ہی معروضات کی روشنی میں مہدی حسن صاحب نے دارالمصنفین اعظم گڑھ کے سامنے کچھ تجاویز رکھی تھیں۔آخر الذکر اسی تجویزی خط کا مدلل جواب ہے۔اس سے قبل سید صاحب نے اپنے ایک مضمون میں اردو میں ایک جامع انسائیکلوپیڈیا تیار کرنے کی تجویز رکھی تھی اور اردو ادب میں انسائیکلوپیڈیا کا یہ تصور شاید پہلا تھا۔اس کی ترتیب کی معقول دلیل بھی انھوں نے پیش کی تھی لیکن قوم کی بہت سی محرومیوں کے ساتھ ایک اور محرومی کا اضافہ ہوا کہ سید صاحب کا یہ خواب خواب ہی رہا۔مہدی حسن صاحب کو انھوں نے اس مضمون کا بھی حوالہ دیا کہ بازار میں ڈیمانڈ نہ ہونے کی وجہ سے وہ منصوبہ ناکام رہا اس لیے کہ پروفیسر براؤن کے یہ مشورے یہاں کی فضا کے ہم آہنگ نہیں ہیں۔سید صاحب فرماتے ہیں:

''ہمارے نزدیک یہ اس وقت تک ناقابلِ عمل ہیں جب تک ملک میں اس کی مانگ اور اس کی قدر دانی کا جذبہ نہ پیدا ہو''۔(نقوشِ سلیمانی،ص:۱۸۴)

اپریل ۱۹۱۶ء میں شاید کانگریس کی طرف سے ''ہوم رول'' کی تجویز آئی تھی تو سید صاحب نے یہ مضمون ''ہوم رول سے پہلے ہوم لنگویج'' تحریر کیا تھا جس میں انھوں نے

کہا کہ ہوم رول کے تخیل سے پہلے ورنہ کم از کم ساتھ ساتھ ہوم لنگویج کا فیصلہ کر لینا چاہیے۔(نقوش،ص:۱۹۴)اس مضمون میں بھی ملکی زبان میں تعلیم دیے جانے پر سید صاحب نے خاصا زور دیا ہے۔انھوں نے لکھا کہ ہمارے نزدیک تو صرف اس کا علاج اردو زبان ہے جس کی عملاً ہمہ گیری اور عمومیت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔(نقوش،ص:۱۹۷-۱۹۸)''اردو کیوں کر پیدا ہوئی''میں السنۂ عالم کے جملہ خاندانوں کا جائزہ لیا گیا ہے،اردو کی پیدائش کے اسباب وعوامل اور پس منظر سے بھی بحث کی گئی ہے۔وہ لکھتے ہیں:''اسلامی عہد کی ادبی تاریخ کے گہرے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مخلوط زبان سندھ، گجرات،اودھ،دکن، پنجاب اور بنگال ہر جگہ کی صوبہ دار زبانوں سے مل کر ہر صوبے میں الگ الگ پیدا ہوئی''۔(نقوش،ص:۲۵۱)ایک لسانی اصول کی وضاحت کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:''ہر زبان تین قسم کے لفظوں سے بنتی ہے۔اسم،فعل،حرف۔اس بولی میں جس کو اب اردو کہنے لگے ہیں،فعل جتنے ہیں وہ دہلوی ہندی کے ہیں۔حرف جتنے ہیں ایک دو کو چھوڑ کر وہ ہندی کے ہیں البتہ اسم میں آدھے اس ہندی کے اور آدھے عربی،فارسی،اور ترکی کے لفظ ہیں''۔(نقوش،ص:۲۵۵)

اردو لسانیات کے باب میں یہ مضمون بہت وقیع ہے۔یہ خیال کہ سید صاحب علمِ لسانیات سے سرے سے واقف نہیں تھے زیادہ صحیح نہیں ہے،البتہ عالمی سطح پر لسانیات کی مہارت ان کے یہاں ڈھونڈنا مشکل ہے تاہم مشرقی زبانوں بطورِ خاص عربی، فارسی اور ہندوستان کی دیگر علاقائی زبانوں میں سید صاحب کو دسترس حاصل تھی اور وہ بحسن وخوبی ان زبانوں کی باریکیوں سے باخبر تھے۔''بہار کے نوجوان اور ادب کی خدمت'' کو اسی سال قبل کی اردو ادب کی تاریخ کا ایک اہم جز قرار دیا جا سکتا ہے۔آٹھ دہائیوں پہلے کا لکھا ہوا یہ ایک تجزیاتی مضمون ہے لیکن آج کے تناظر میں بھی اگر اس مضمون کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سید صاحب کے پیش کردہ یہ سارے نقطوں اور مفید مشوروں کی معنویت علیٰ حالہ برقرار ہے۔نئے شعرا و ادبا کے لیے انھوں نے جو رہنما خطوط پیش کیے تھے وہ سب کے سب آج بھی منتظرِ عمل ہیں۔

''بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق'' دو قسطوں کا ایک طویل مضمون ہے جس میں

بالدلیل قدیم الفاظ کی دل چسپ تحقیق پیش کی گئی ہے۔علامہ ندوی کو چوں کہ عربی، فارسی اور انگریزی پر یکساں عبور حاصل تھا اور اردو تو ان کی مادری ہی زبان تھی اس لیے لفظوں کی تحقیق میں مزید دل کشی پیدا ہوگئی ہے۔''تمہید'' کو بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی سمجھنا چاہیے بلکہ بعض اعتبار سے یہ مضمون اول الذکر سے زیادہ جامع اور پرلطف ہے۔'تمہید' میں یہ بتایا گیا ہے کہ عربی، فارسی اور سنسکرت سے ''ہندوستانی'' تک کس طرح لفظوں کا سفر طے ہوا اور بالآخر یہاں آکر ان کی حتمی شکل کیا بنی۔اس باب میں سید صاحب کا خیال یہ ہے کہ جس طرح سے ایک مہاجر ہجرت کر کے جس خطۂ ارضی کو اپنا مستقل مسکن بناتا ہے اور اسے وہیں کے قانون کے مطابق خود کو ڈھالنا پڑتا ہے اسی طرح لفظوں کی ہجرت کا حال ہے۔اس ردو بدل اور شکست و ریخت کو سید صاحب نے ہر زندہ زبان کا حق قرار دیا ہے۔

''اکبر کا ظریفانہ کلام'' میں علامہ مرحوم نے اکبرالہ آبادی کے ظریفانہ شاعری پر بھر پور گفتگو کی ہے۔اہل ادب واقف ہیں کہ اکبر مرحوم نے ہندی معاشرے کو مغربی طرز زندگی کی خرابیوں سے آگاہ کر کے اس کے نقصانات سمجھائے بلکہ مغرب کا کھلم کھلا مذاق بھی اڑایا۔سید صاحب نے اپنے سات نکات کے ذریعے اکبر کی شعری خصوصیات و امتیازات کو بیان کیا ہے اور مثالوں کے ذریعے کلامِ اکبر کی تفہیم کو آسان کرنے کی خوب صورت کوشش کی ہے۔''جواہر الاسرار میں کبیر کی بات چیت'' یہ ایک تشنہ اور ادھورا تاثراتی مضمون ہے۔''ہاشم علی کا مجموعۂ مراثی'' یہ مضمون بظاہر ہاشم علی کے مرثیوں کے مجموعے پر ایک تبصراتی مضمون ہے لیکن اس ضمن میں سید صاحب کی دکنی زبان پر دسترس اور اس پر گہری نظر کا بخوبی علم ہو جاتا ہے۔

اردو میں تعمیری ادب میں بھی سید صاحب کا نام نمایاں ہے۔غیر افسانوی نثر میں سوانح نگاری اور سفرنامہ نگاری میں بطور خاص انھوں نے اپنی توجہ صرف کی۔ادبی صحافت سے بھی ان کی گہری وابستگی رہی ہے جس کی گواہی ''معارف'' اعظم گڑھ سے بآسانی لی جاسکتی ہے۔انور سدید مرحوم نے انھیں شبلی اسکول کا رکنِ رکین قرار دیا ہے۔انور سدید لکھتے ہیں: ''وہ اعلیٰ پائے کے نقاد تھے۔حالی و شبلی، جگر اور شاد پر ان کے مضامین جمالیاتی تنقید کی

مثالیں ہیں''۔(تاریخ اردو ادب،ص:۳۸۷)

سید صاحب کی اس کتاب میں مکتوب نگاری پر بھی دو اہم مضامین شامل ہیں۔ اول ''مکاتیب شبلی'' دوسرا ''مکاتیب مہدی''۔اول الذکر میں شبلی کے اولین مجموعہ خطوط کی جمع آوری اور خطوط کی خصوصیات و امتیازات پر عمدہ گفتگو کی گئی ہے۔آخر الذکر میں خط کی تاریخ و تعریف اور اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے مہدی افادی کے خطوط کے امتیازات بھی بیان کیے ہیں۔وہ لکھتے ہیں: ''مرحوم کا قلم حد سے زیادہ چلبلا اور البیلا تھا۔نوکِ قلم پر جو بات آگئی وہ ناگفتنی بھی ہوتی تو گفتنی ہو کر نکل جاتی اور پھر اس طرح نکلتی کہ شوخی صدقے ہوتی اور متانت مسکرا کر آنکھیں نیچی کر لیتی''۔(نقوش،ص:۳۸۵) لیکن کہیں کہیں سید صاحب کا قلم تنقید کرتے کرتے ذاتی یادوں اور محبت وعقیدت کی سرحد میں جا گھستا ہے جو تنقید کے مزاج کے خلاف ہے۔اس کے باوجود یہ مضمون سید صاحب کی تنقیدی بصیرت کا واضح ثبوت ہے اور اردو مکتوب نگاری کے باب میں ایک خاصے کی چیز بھی۔

عبادت بریلوی نے سید صاحب کی عملی تنقید پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے: ''سید سلیمان ندوی کی عملی تنقید کو دیکھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شاعری کی خصوصیات تو بیان کر دیتے ہیں لیکن اس سلسلے میں محض اصولوں سے کام نہیں لیتے۔اسی وجہ سے کوئی معقول تجزیہ ان کے یہاں نہیں ملتا''۔(اردو تنقید کا ارتقا،ص:۲۶۹)

حق یہ ہے کہ سید صاحب کا اصل میدان تحقیق ہے خواہ اس کا تعلق ادب سے ہو یا تاریخ سے،تاہم اردو تنقید میں بھی وہ اپنی ایک نظر رکھتے ہیں۔چناں چہ مشرقی تنقید کے حوالے سے عبادت بریلوی خود لکھتے ہیں: ''تنقید کی مشرقی اصطلاحات سے وہ اپنی تنقیدی تحریروں میں ضرور کام لیتے ہیں۔فصاحت و بلاغت،تشبیہات و استعارات،لطافت و روانی، بے ساختگی، آمد،آورد،جدتِ ادا،غرض یہ کہ اس قسم کی تمام اصطلاحات ان کی تنقید میں ملتی ہے۔کہیں کہیں انھوں نے سادگی اور جوشِ بیان وغیرہ کی اصطلاحات سے بھی کام لیا ہے جس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی عہدِ تغیر کی تنقید سے متاثر ہیں''۔(اردو تنقید کا ارتقا،ص:۲۶۹)

حالی کی مسدس ایک نظم ہی نہیں اسے مسلم معاشرے کے مختلف طبقوں میں در آنے والی خرابیوں کی اصلاح کا ایک جامع انسائیکلو پیڈیا کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔سید صاحب لکھتے ہیں کہ حالی نے روایت سے بغاوت کر کے اردو شاعری کوایک نئی جہت عطا کی ۔''مسدس حالی'' یہ مضمون دراصل مسدس پر لکھا سید صاحب کا دیباچہ ہے۔مسدس کا اتنا خوب صورت تجزیہ شاید ہی اس سے قبل کسی نے کیا ہو۔اس مضمون میں مسدس کی تالیف کے پس پردہ اس کے اسباب ومحرکات، مقاصد اور موضوعاتی وفنی پہلو سے اس پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔اس تجزیاتی مضمون کے مطالعے سے حالی کے مسدس پڑھنے کا اشتیاق مزید بڑھ جاتا ہے اور جواس کا مطالعہ کر چکا ہے اس کے دل میں دوبارہ اس کے پڑھنے کا جذبہ انگڑائی لینے لگتا ہے۔سید صاحب نے کلام شاد پر جو مقدمہ تحریر کیا ہے وہ ایک انتہائی تشنہ تبصراتی مضمون ہے۔وہ شادکوایک عظیم شاعر ضرور تسلیم کرتے ہیں تاہم مدلل انداز میں ان کے کلام پر گفتگو کرنے سے سید صاحب کا قلم جھجھک محسوس کرتا ہے۔اس کی وجہ بھی سید صاحب خود ہی 'عدیم الفرصتی' بیان کرتے ہیں اور ساتھ ہی اس پر اظہارِ افسوس بھی کرتے ہیں کہ اب تک 'کلیاتِ شاد' منظرِ عام پر نہیں آ پایا ہے لیکن اس سے وہ مایوس بھی نہیں ہوتے۔چناں چہ سید صاحب کی وفات کے ۲۲ سال بعد ۱۹۷۵ء میں بہار اردو اکادمی کے زیر اہتمام کلیم الدین احمد نے تین ضخیم جلدوں میں کلیاتِ شاد مرتب کر کے شائع کیا۔

''شعلۂ طور'' یہ جگر مراد آبادی کا شعری مجموعہ ہے۔''تعارف نو وارد شاعر'' یہ مضمون دراصل اسی مجموعے کا دیباچہ ہے۔اس میں تنقید کم اور تعارف وتبصرہ زیادہ ہے۔جگر کا تعارف کرتے ہوئے سید صاحب لکھتے ہیں: ''جگر شاعر ہے مگر کیسا شاعر؟ تنہا شاعر، بلکہ ہمہ شاعر،ان کا طرز ابنائے زمانہ کے طرز سے الگ، لکھنؤ اور دہلی دونوں حکومتوں سے آزاد، موزوں الفاظ اور دل کش ترکیبوں کے باوجود بے ساختگی اور آمد سے معمور، ہر تکلف، تعمق اور آورد سے پاک، طلسمِ الفاظ سے خیالات کی ایک دنیا بنا کر کھڑی کر دینے والا''۔(نقوش،ص:۳۲۹) یہ تحریر جگر اور کلامِ جگر کے مختصر تعارف پر مشتمل ہے اور انداز ایسا کہ اسے

جگر کا خاکہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ ’’خیابان‘‘ یہ تحریر محمود اسرائیلی کے مجموعۂ غزل ’’خیابان‘‘ کا مقدمہ ہے۔ اس میں غزل گوئی پر سید صاحب نے بڑی عمدہ بحث کی ہے۔ فنِ غزل پر گفتگو کرتے ہوئے معاصر شاعری کے بدلتے ہوئے منظر نامے کا جائزہ بھی لیا ہے اور ساتھ ہی اسرائیلی کی شاعری کو شبلی و ظفر علی خان اور اقبال کے رنگِ سخن کا حسین سنگم قرار دیا ہے۔ یہاں بھی تنقید کے بجائے تقریظ کا رنگ غالب ہے۔ ’’کلیاتِ عشق‘‘ ایک طویل مضمون ہے جو شاہ رکن الدین عشق عظیم آبادی کے کلیات کا مقدمہ ہے۔ عشق صاحب ایک صوفی شاعر تھے۔ اس دیباچے کا تقریباً نصف حصہ تصوف اور اس کے مختلف سلسلوں کے بیان میں صرف کیا گیا ہے۔ نصفِ ثانی میں بھی آدھا حصہ کلامِ عشق پر معروضی گفتگو کی گئی ہے اور بقیہ حصے میں عشق و جذب سے معمور شاعر کے اشعار درج کیے گئے ہیں۔

’’خمستان‘‘ عبدالسمیع مآل اثر صہبائی کا مجموعۂ کلام ہے۔ صہبائی پنجاب کے معروف شاعر تھے اور مختلف اصنافِ شاعری میں طبع آزمائی کے ساتھ رباعی گوئی میں سندِ امتیاز رکھتے تھے۔ ’’خمستان‘‘ ہی کے عنوان سے سید صاحب نے اس کا دیباچہ تحریر کیا تھا۔ اس میں انھوں نے شاعر کے گردوپیش کے حالات کا جائزہ پیش کرتے ہوئے ان کے کلام پر خاطر خواہ گفتگو کی ہے۔ لکھتے ہیں: ’’صہبائی کے فطری شاعر ہونے میں کلام نہیں، ان کا دل عشق و محبت سے لبریز اور نالۂ و شیون سے معمور ہے‘‘۔ (نقوش، ص: ۴۳۴) اس میں نو جوان شعرا کو کچھ مشورے اور پنجاب کے دیگر شعرا کا بھی مختصراً ذکر کیا ہے۔

’’گلستانِ امجد‘‘ کے بشمول اخیر میں دو مضامین اور ہیں۔ ’’معطرِ سخن‘‘ اور ’’حقیقتِ علمی شاعری‘‘ جو انتہائی سرسری اور تشنہ ہیں۔ الحاصل علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم جہاں ایک طرف جہاں دیدہ عالمِ دین اور اسلامی علوم کے ماہر و دانشور تھے وہیں علم و قلم کے شناور بھی۔ ان کے قلم سے علم و ادب کے کئی آبشار نکلے ہیں اور تشنگانِ علم و ادب نے ان سے اپنی پیاس بجھائی ہے۔ امید کہ میری یہ تحریر مطالعۂ سلیمانی کے باب میں کوئی تحرک پیدا کر سکے گی اور مزید ان کے نام و کام کو آگے بڑھانے کے لیے بیداری کا باعث بھی ہو سکے گی۔

کتابیات:

اردو تنقید کا ارتقا، عبادت بریلوی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ (۲۰۱۳ء) پانچواں ایڈیشن

اردو زبان کی مختصر ترین تاریخ، سلیم اختر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی (۲۰۱۳ء) دوسرا ایڈیشن

اردو ادب کی مختصر تاریخ، انور سدید، عالمی میڈیا پرائیویٹ لمیٹیڈ دہلی (۲۰۱۴ء)

نقوشِ سلیمانی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ (۱۹۹۳ء) چوتھا ایڈیشن۔

فاروق اعظم قاسمی۔ پی ایچ ڈی اسکالر جواہر لعل نہرو یونیورسٹی نئی دہلی۔

(بہ شکریہ ماہنامہ اردو دنیا دہلی نومبر ۲۰۱۶ء)

سید صاحب کا تصورادب

طلحہ نعمت ندوی

حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے علم وادب کے وسیع اقلیم پر جس طرح شہر یاری کی ہے وہ دنیائے علم سے مخفی نہیں، انہوں نے جن اساتذہ کی صحبت اٹھائی اور جس مادر علمی سے کسب فیض کیا وہ سب کے سب اپنے پاکیزہ ذوقِ ادب اور تعمیری و مثبت ادب کو فروغ دینے میں معروف رہے ہیں۔ تعمیری ادب اور پاکیزہ صحافت دارالعلوم ندوۃ العلماء کے دورِ آغاز ہی سے اس کا طرۂ امتیاز رہا ہے، اس نے کبھی غیر اخلاقی ادب اور منفی لٹریچر کو اپنے دامن میں جگہ نہیں دی، اور دین وادب کی ہم آہنگی کا وہ تصور پیش کیا جس سے ہندستانی مدارس بیگانہ تھے، اس کا سب سے بڑا کارنامہ زبان وادب کے نفیس اور عمدہ سے عمدہ تر قالب میں اسلامی حقائق وتعلیمات، مذہبی ارشادات واقوال اور دینی مباحث کو پیش کر کے عصری تعلیم یافتہ طبقہ کو مطمئن کرنا، اور اسلام پر اس کے اعتماد رفتہ بحال کرنا ہے۔

حضرت علامہ کا کارنامہ اس ناحیہ سے تمام ندوی فضلاء اور اس کے بزرگوں میں ممتاز ہے کہ انہوں نے سیرت النبی کی پانچ ضخیم جلدوں میں قرآن وحدیث اور فقہ وکلام کے دقیق مباحث اور پیچیدہ مسائل کی گتھیاں جس باریک بینی اور دقت نظر سے سلجھائی ہیں اور اس کے ساتھ جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب علیہ الرحمہ کے الفاظ میں اپنی انشاء نگاری کا جو قصر شریں تعمیر کیا ہے وہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں، سید صاحب کی ''خطبات مدراس'' کو انشاء نگاری اور ادب اسلامی دونوں کا شاہکار کہا جائے تو بجا ہے۔

ادب سے متعلق حضرت سید صاحب کے نظریات وافکار پر ابھی پوری طرح کام نہیں ہوا ہے، حضرت سید صاحب کے نظریات میں تعمیری پہلو جس طرح نمایاں ہے وہ اہل علم

سے مخفی نہیں ،قرآن پاک کی بلاغت میں ماہرین کی دو رائیں رہی ہیں کہ آیا اس کی بلاغت لفظی تھی یا معنوی ،سید صاحب معنوی بلاغت کو راجح قرار دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں ۔

''عام خیال ہے کہ اہل عرب جو قرآن مجید سن کر اسلام قبول کر لیتے تھے وہ صرف فصاحت وبلاغت کا کرشمہ تھا یعنی چونکہ عرب میں شعر و خطابت کا بہت چرچا تھا اور تمام ملک میں شاعری کا مذاق سرایت کر گیا تھا اس لئے وہ دیکھتے تھے کہ کسی اور شاعر یا خطیب کا کلام ایسا فصیح وبلیغ نہیں ہے تو وہ اسلام قبول کر لیتے تھے ،بے شبہ قرآن مجید فصاحت وبلاغت کے لحاظ سے معجزہ ہے لیکن اس کا اعجاز جس قدر عبارت وانشاء میں ہے اس سے کہیں زیادہ معانی ومطالب میں ہے ۔فرض کرو کہ قرآن مجید فصاحت وبلاغت کے لحاظ سے ایسا ہی معجزہ ہوتا جیسا کہ اب ہے لیکن اس میں صرف تاریخی واقعات یا اسی قسم کی کوئی اور بات ہوتی تو کیا یہ اعجاز پیدا ہو سکتا تھا ،قرآن مجید ایک طرف تو فصاحت وبلاغت کی بنا پر اعجاز کا کام دیتا تھا ،دوسری طرف جو مقاصد و مطالب ادا کرتا تھا وہ اسلام ہی کے مقاصد اور مطالب تھے ،وہ خدا کی عظمت وجلالت ،اصنام کی تحقیر ،انسان کا عجز و تقلید ،سزا و جزا ،بعث ونشر ،جور وظلم کی تقبیح ،اخلاق حسنہ کی تحسین ، ان مطالب کو اس طرح ادا کرتا تھا کہ وہ خود بہ خود لوگوں میں گھر کرتے جاتے تھے''۔(سیرۃ النبی جلد چہارم ص ۲۸۴ طبع جدید دار المصنفین)

اسی طرح غزوۂ حنین کے بعد انصار صحابہ کی معمولی سی رنجش پر آپ ﷺ نے ان کے مجمع میں جو بلیغ خطبہ دیا تھا اس کا ذکر کرتے ہوئے سید صاحب لکھتے ہیں :۔

''اس خطبہ کے وجوہ بلاغت پر غور کیا جائے تو ایک مختصر رسالہ تیار ہو سکتا ہے''۔(سیرۃ النبی جلد دوم بعنوان خطابت نبوی)

یہ چند نمونے ہیں جن کی روشنی میں ادب اسلامی کے تئیں سید صاحب کی معنویت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔نیز ان کی ادبی کتاب ''نقوش سلیمانی'' میں بھی مختلف نمونے ملتے ہیں ،وہ جا بہ جا ہندوستان کے بزرگوں کی تحریر کردہ اردو کی ابتدائی دینی کتابوں کو زبان وادب کا اعلیٰ معیار تسلیم کرتے نظر آتے ہیں ۔

انہوں نے اپنے تلامذہ کی رہنمائی کرتے ہوئے انہیں وقتاً فوقتاً جو خطوط لکھے ہیں اس میں عصر حاضر کے اردو اور عربی کے مغرب زدہ ادباء اور مغربی ادب کے حامیوں اور ترجمانوں پر جس طرح تنقید کی ہے اور اپنے شذرات کے ذریعہ وقتاً وقتاً ملک کے غیر اخلاقی رجحان ادب پر جس طرح تنبیہ و تنقید کرتے رہے وہ ان کے ادبی نظریات کا ایک اہم باب ہے۔

انہوں نے حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کی خلافت سے سرفراز ہونے کے بعد قیام بھوپال کے دوران ترقی پسند تحریک کے افتتاحی اجلاس میں شرکت فرمائی جس میں صدر کرشن چندر اور مہمان خصوصی سید صاحب تھے، لوگوں کو تعجب تھا کہ یہ سرفرازئ خلافت اور ادھر ترقی پسند تحریک کی حمایت؟! لیکن اس اجلاس میں آپ نے نوجوان ادباء کو جو نصیحتیں کیں وہ قابل ذکر ہیں، اسی اجلاس میں کرشن چندر اور عصمت چغتائی کے بارے میں سید صاحب سوال کیا گیا تو انہوں نے اس کے جواب میں فرمایا: ’’دونوں بے حیائی میں دوڑ کر رہے ہیں دیکھئے کس کی جیت ہوتی ہے‘‘۔

غرض سید صاحب کے ادبی نظریات پر مستقل کام کرنے کی ضرورت ہے، ایک دو صفحات میں اس کا اجمالی خاکہ پیش کرنا بھی ناممکن ہے۔

سید صاحب ماہ و سال کے آئینہ میں

(۱۸۸۴ء تا ۱۹۵۳ء)

ترتیب: ابوذر محمد شیبان استھانوی

۱۸۸۴ء = ۰۲-۱۳۰۱ھ: ۲۲/نومبر ولادت (دیسنہ)

۱۸۹۹ء = ۱۶-۱۳۱۵ھ: وطن میں ابتدائی تعلیم، کچھ دنوں کے بعد اسلام پور میں اپنے والد کے ساتھ گذار کر مدرسہ خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف پٹنہ میں داخلہ، کچھ دنوں مدرسہ امدادیہ دربھنگہ میں داخلہ اور تعلیم۔

۱۹۰۰ء = ۲۰-۱۳۱۹ھ: عظیم آباد میں تاریخ ساز اجلاس میں شرکت،

۱۹۰۱ء = ۲۱-۱۳۲۰ھ: فروری مطابق شوال میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ۔

۱۹۰۲ء = ۲۲-۱۳۲۱ھ: الپنچ بانکی پور میں سب سے پہلے مضمون کی اشاعت، اسی سال ''وقت'' کے عنوان سے ''مخزن'' لاہور میں ایک مضمون کی اشاعت۔

۱۹۰۳ء = ۲۳-۱۳۲۲ھ: نواب محسن الملک کی شان میں ان کی ندوۃ العلماء آمد کے موقع پر ایک مدحیہ قصیدہ اور حضرت شاہ سلیمان پھلواروی کی تحسین وتعریف، اگست اور نومبر کے رسالہ ''بہار'' بانکی پور کے شماروں میں دو نظموں کی اشاعت۔

۱۹۰۴ء = ۲۴-۱۳۲۳ھ: علامہ شبلی کا ندوۃ العلماء میں قیام اور ان کی پہلی زیارت۔

۱۹۰۵ء = ۲۵-۱۳۲۴ھ: ندوۃ العلماء میں علامہ شبلی کا مستقل قیام اور ان کی شان میں سید صاحب کا ایک طویل فارسی قصیدہ، اسی سال ''الندوہ'' میں ''علم حدیث'' کے عنوان سے ایک مضمون کی اشاعت، اسی سال عربی مجلّہ ''البیان'' لکھنؤ میں دو عربی قصیدوں کی اشاعت، جرجی زیدان کی کتاب اللغۃ العربیہ کی تلخیص اور ''الندوہ'' میں اشاعت۔

۱۹۰۶ء=۲۶-۱۳۲۵ھ: الندوہ کی سب ایڈیٹری، ندوہ کے اجلاس بنارس میں پہلی عوامی تقریر، الندوہ میں حیات مالک کے عنوان سے ایک طویل مضمون کی اشاعت۔

۱۹۰۷ء=۲۷-۱۳۲۶ھ: دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فراغت، عطائے سند اور اسی اجلاس میں عربی میں برجستہ تقریر اور ہیں تمام ملک میں اس کی صدائے بازگشت اور شہرت۔

۱۹۰۸ء=۲۸-۱۳۲۷ھ: دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ادیب اول کے عہدہ پر تقرر، الندوہ میں مختلف علمی اور تحقیقی مضامین کی اشاعت اور علمی کاموں کا باضابطہ آغاز، ''دروس الادب'' کی تصنیف۔

۱۹۰۹ء=۲۹-۱۳۲۸ھ: ''خواتین اسلام کی بہادری'' کے عنوان سے الندوہ میں ایک سلسلۂ مضامین کی اشاعت۔

۱۹۱۰ء=۳۰-۱۳۲۹ھ: فروری میں منعقدہ ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس دہلی میں شرکت، اس جلسہ میں عربی کے جدید الفاظ کی ترتیب وتدوین کے لئے آپ کا انتخاب، سیرۃ النبی کی تالیف میں شرکت، ''صیغہ تصحیح اغلاط تاریخی'' کی بنیاد پڑی، سید صاحب کو اس کا سکریٹری مقرر کیا گیا۔

۱۹۱۱ء=۳۱-۱۳۳۰ھ: سیالکوٹ (پنجاب) کا سفر اور وہاں کے انجمن شبان المسلمین میں ''مذہب اسلام اور عقل'' کے عنوان سے خطبہ، الندوہ کی باضابطہ ادارت، نیز سابقہ کام سیرۃ النبی کی ترتیب میں استاذ محترم کے تعاون میں سرگرمی۔

۱۹۱۲ء=۳۲-۱۳۳۱ھ: محمڈن کانفرنس میں شرکت کے لئے مدراس کا سفر، ندوۃ العلماء کا سالانہ تاریخ ساز اجلاس منعقدہ لکھنؤ زیر صدارت علامہ سید رضا مصری، اس میں سید صاحب پیش پیش تھے اور اردو سے عربی میں متعدد تقریروں کے ترجمے کئے، لغات جدیدہ کی اشاعت۔

۱۹۱۳ء=۳۳-۱۳۳۲ھ: مولانا ابوالکلام کے ساتھ ان کے اخبار ''الہلال'' میں شرکت اور مختلف مؤثر مضامین کی اشاعت، ''مشہد اکبر'' کے عنوان سے ایک اہم مضمون، جو

''الہلال'' میں شائع ہوا اور حکومت نے وہ شمارہ ضبط کرلیا۔

اواخر سال میں دکن کالج پونا میں استاذ عربی و فارسی کی حیثیت سے تقرری، ارض القرآن کے لئے تیاری، اس کے لئے پونا میں عبرانی زبان کی تحصیل، ارض القرآن کی پہلی جلد کی تکمیل کے بعد دوسری جلد کے لئے تیاری۔

۱۹۱۴ء=۳۳-۱۳۳۲ھ: ۱۸ نومبر کو استاذ محترم کی رحلت، شاگرد رشید کو استاذ کی وصیت، دکن کالج سے استعفیٰ، مولانا شبلیؒ کی وفات پر ایک طویل مرثیہ کی اشاعت۔

۱۹۱۵ء=۳۵-۱۳۳۴ھ: دارالمصنفین کی تاسیس اور اعظم گڑھ میں مستقل قیام، ارض القرآن کی پہلی جلد کی اشاعت۔

۱۹۱۶ء=۳۶-۱۳۳۵ھ: سیاسی تحریک میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے ساتھ شرکت، ۲۹ نومبر کو بھوپال کا سفر، مولانا شبلی کے حالات پر زمیندار لاہور میں ایک مضمون کی اشاعت، دارالعلوم ندوۃ العلماء کی نئی عمارت میں ندوۃ العلماء کا چودھواں اجلاس اور سید صاحب کی ندوۃ العلماء کے اغراض و مقاصد اور اس کی اہمیت و ضرورت پر ایک جامع تقریر۔

۱۹۱۷ء=۳۷-۱۳۳۶ھ: کلکتہ کا سفر، جلسۂ علمائے بنگالہ کی صدارت، ''رسالہ اہل سنت والجماعت'' کی معارف میں قسط وار اشاعت، حیات مالک کی اشاعت، ۱۲ اپریل کو پہلی اہلیہ کا انتقال، بمبئی میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں شرکت اور مسٹر مظہر الحق پر ایک نظم، پونہ میں اسلامیہ اسکول میں ندوۃ العلماء کے پندرہویں اجلاس میں شرکت اور تقریب۔

۱۹۱۸ء=۳۸-۱۳۳۷ھ: سیرۃ النبیؐ جلد اول کی ترتیب و اشاعت، ارض القرآن جلد دوم کی اشاعت، معارف کی کئی قسطوں میں ''ہندوؤں کی تعلیمی ترقی میں مسلمانوں کی کوشش'' کے عنوان سے ایک تحقیقی مضمون کی اشاعت۔

۱۹۱۹ء=۳۹-۱۳۳۸ھ: تحریک خلافت کا قیام، اس میں شرکت اور اس کے اجلاس لکھنؤ میں تقریر، ندوۃ العلماء کے اٹھارہویں اجلاس منعقدہ بلگام میں شرکت اور تقریر، جمعیت علمائے ہند کی بنیاد اور رکنیت۔

۱۹۲۰ء=۴۰-۱۳۳۹ھ: وفد خلافت کے رکن حیثیت سے یورپ کا سفر، اور تقریباً ۹ ماہ یورپ کے مختلف ممالک لندن، فرانس، اٹلی میں قیام اور مسلمانان ہند کے مسائل کے حل کی کوشش، ارباب حکومت اور اہل علم انگریزوں اور عرب وفود سے ملاقات اور تبادلۂ خیال، سیرۃ النبی جلد دوم اور سیرت عائشہ کی اشاعت۔ جامعہ ملیہ کا قیام اور اس کی رکنیت اور اس کے فروغ میں دلچسپی کا اظہار، کانگریس کے اجلاس میں شرکت کے لئے ناگپور کا سفر۔

۱۹۲۱ء=۴۱-۱۳۴۰ھ: تحریک ترک موالات کے سلسلہ میں علماء کے ساتھ ملک کا دورہ، مجلس خلافت کے سالانہ اجلاس میرٹھ کی صدارت اور تقریر، احمد آباد (گجرات) میں منعقدہ کانگریس کے اجلاس میں شرکت، اور اس کی ورکنگ کمیٹی کی رکنیت کے لئے آپ کا انتخاب، سیرت النبی جلد سوم کی تدوین میں مشغولیت۔

۱۹۲۲ء=۴۲-۱۳۴۱ھ: نومبر میں اجلاس خلافت اور کانگریس کمیٹی کلکتہ میں شرکت، دسمبر میں جلسہ تقسیم اسناد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شرکت۔

۱۹۲۳ء=۴۳-۱۳۴۲ھ: صوبہ بہار کی خلافت کانفرنس کی صدارت اور تقریر، ندوۃ العلماء کی تعلیمی نگرانی۔

۱۹۲۴ء=۴۴-۱۳۴۳ھ: سیرۃ النبی جلد سوم کی اشاعت، وفد حجاز کی صدارت اور حجاز و مصر کا سفر، اور وہاں ڈیڑھ ماہ کی اقامت اور باہمی اختلافات کے حل کی کوشش۔

۱۹۲۵ء=۴۵-۱۳۴۴ھ: ندوۃ العلماء کے تعاون کے لئے صوبہ بہار کے مختلف شہروں اور دیہاتوں کا دورہ، مدراس کا سفر، مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن آف موڈرن انڈیا کی دعوت پر سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤں پر آٹھ خطبے جو خطبات مدراس کے نام سے شائع ہو کر مشہور ہوئے، دسمبر کے آخری مہینہ میں کانپور میں خلافت اور کانگریس کے اجلاسوں میں شرکت، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی پچاس سالہ جوبلی میں شرکت۔

۱۹۲۶ء=۴۶-۱۳۴۵ھ: جمعیۃ العلماء کے سالانہ اجلاس منعقدہ کلکتہ کی صدارت، وفد حجاز کے صدر بن کر وفد کے ساتھ مؤتمر اسلامی مکہ مکرمہ میں شرکت اور نائب صدر مؤتمر

کی حیثیت سے انتخاب، مارگولیتھ سے علمی معرکہ، مستشرقین کے اسلامی حملوں کا جواب، پروفیسر کولیم سے علمی مباحثہ، ندوۃ العلماء کے اجلاس کانپور میں شرکت۔

۱۹۲۷ء=۴۷-۱۳۴۶ھ: ایک یورپین اہل قلم کے اس اعتراض کا مناقشہ کہ مسلمان ارسطو کی گاڑی کے قلی تھے، خواتین کے قوانین پر اعتراض کے جواب میں ''مسلمان عورتوں کے حقوق'' کے عنوان سے ایک طویل مضمون، لاہور کا سفر، انجمن حمایت اسلام لاہور میں تقریر، مجلس العلماء کی صدارت کے لئے ترچناپلی کا سفر، اور مدارس کا معائنہ، ویشارم، آمبور، عمرآباد، بنگلور، میسور، اور حیدرآباد میں تقریریں اور ندوۃ العلماء کے دارالاقامہ کی تعمیر کے لئے کوشش، اور جامعہ عثمانیہ کا معائنہ، ندوہ کے بائیسویں اجلاس امرتسر میں شرکت، جمعیۃ العلماء کے اجلاس منعقدہ پشاور میں شرکت کے لئے سفر۔

۱۹۲۸ء=۴۸-۱۳۴۷ھ: ''ہندوستان اور علم حدیث'' کے عنوان سے مفصل مضمون کی معارف کے کئی شماروں میں اشاعت، حیدرآباد کا سفر، نظام دکن سے ملاقات، ساردا ایکٹ کے خلاف احتجاج۔

۱۹۲۹ء=۴۹-۱۳۴۸ھ: ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کی دعوت پر ''عرب وہند کے تعلقات'' پر لکچر اور اس کی اشاعت۔

۱۹۳۰ء=۵۰-۱۳۴۹ھ: ندوۃ العلماء کے لئے سرمایہ کی فراہمی، جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس امروہہ میں شرکت، آل انڈیا اورینٹل کانفرنس ہسٹاریکل ریکارڈس سوسائٹی کے اجلاس منعقدہ پٹنہ میں شرکت، دسمبر میں ''خیام'' کے عنوان سے ایک مقالہ۔

۱۹۳۱ء=۵۱-۱۳۵۰ھ: ''عربوں کی جہاز رانی'' کے عنوان سے بمبئی گورنمنٹ کے شعبۂ تعلیم میں چار خطبے، انگریزی اخبار اسٹیٹسمین کے ایک غلط مضمون کی تردید، نیاز فتحپوری کے خلاف سخت احتجاج۔

۱۹۳۲ء=۵۲-۱۳۵۱ھ: سیرۃ النبیؐ جلد چہارم کی اشاعت، ندوۃ العلماء سے عربی مجلہ الضیاء کا آپ کی نگرانی میں اجراء۔

۱۹۳۳ء=۵۳-۱۳۵۲ھ: مارچ میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی انجمن اردوئے معلیٰ کی دعوت پر ہندوستان میں ہندوستانی پر ایک خطبہ، آفتاب ہاسٹل (مسلم یونیورسٹی) کے طلبہ کے سامنے تقریر، طبیہ کالج (یونیورسٹی) کے ہال میں تقریر، مسلم یونیورسٹی کورٹ کی رکنیت، ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کے سالانہ اجلاس میں شرکت، اس جلسہ میں ڈاکٹر محمد اقبال کی صدارت میں تاج محل اور لال قلعہ کے معمار پر ایک تحقیقی مضمون پڑھ کر سنایا، جولائی میں سیرت نبوی پر تقریر کے لئے بڑودہ (گجرات) کا سفر، گجرات کے مختلف شہروں بھروچ، راندیر، سورت، انکلیشور، ڈابھیل کا دورہ اور تقریریں، حکومت آصفیہ حیدرآباد کی درخواست پر فقہ حنفی کی رو سے اس کے لئے ضابطۂ جنایات قتل وقصاص کی ترتیب، ان کی مشہور تصنیف خیام کی اشاعت جس کی داد ہندوستان سے لے کر کابل وایران اور یورپ کے فضلاء تک نے دی، فردوسی کی ہزار سالہ برسی کے موقع پر افغانستان نے ایران کو دیگر تحائف کے ساتھ خیام بھی دیا، اس پر ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے پانچ سو روپے کا انعام دیا، شاہ افغانستان کی دعوت پر تعلیمی نظام میں مشورہ کے لئے ڈاکٹر اقبال اور سر راس مسعود کے ساتھ افغانستان کا سفر، نادر شاہ سے ملاقات، اسی سفر میں افغانستان کے اہم شہروں غزنی، کابل، قندھار، کوئٹہ وغیرہ کی سیاحت۔

۱۹۳۴ء=۵۴-۱۳۵۳ھ: فروری میں جامعہ ملیہ کے توسیعی خطبات کی صدارت، جون میں صوبہ بہار واڑیسہ کے وزیر تعلیم جناب سید عبدالعزیز کی دعوت پر عربی مدارس کے ترتیب کے سلسلہ میں مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے ساتھ رانچی کا سفر، تاریخ ہند کی تدوین کی اسکیم۔

۱۹۳۵ء=۵۵-۱۳۵۴ھ: جنوری میں لاہور کا سفر کیا اور ڈاکٹر اقبال کے مشورہ سے انجمن حمایت اسلام لاہور کے لئے زنانہ کالج کا خاکہ پیش کیا، ریاست حیدرآباد نے ایک کمیٹی ایسے حضرات کی بنائی جو اسلامی فقہ کی روشنی میں قانون قتل وقصاص کی ترتیب وتدوین کرے۔ اس کے ایک ممبر سید صاحب بھی منتخب ہوئے، جولائی میں حیدرآباد کا سفر کیا، راستے میں بھوپال اتر گئے اور چار دن تک ٹھہرے، قیام کے دوران میں وہ نواب بھوپال سے دارالمصنفین کی امداد

کے سلسلے میں ملے، اکتوبر میں سید صاحب کو پلوریسی (ذات الجنب) ہوگئی، جس کا علاج ہوا، لیکن صحت یاب ہوتے ہوتے چند ماہ لگ گئے اس کے بعد نومبر میں چند ماہ دہرہ دون میں قیام رہا۔ اردو، ہندی کے جھگڑے کا تصفیہ کیا، نومبر میں سیرۃ النبی جلد پنجم شائع ہوئی۔

۱۹۳۶ء=۵۶-۱۳۵۵ھ: ۶ر نومبر کو مولانا شوکت علی نے دہلی میں فلسطین کانفرنس بلائی جس کی صدارت سید صاحب نے کی اور اس میں خطبہ پڑھا۔

۱۹۳۷ء=۵۷-۱۳۵۶ھ: ایک آل انڈیا نمائش کا انتظام لکھنؤ میں کیا گیا تھا، ہندوستانی اکیڈیمی نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی کانفرنس منعقد کی، جس کے شعبہ اردو کی صدارت کے فرائض سید صاحب نے انجام دیئے، اور ایک قابل قدر خطبہ پڑھا جس میں لکھنؤ کی علمی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ مارچ کے آخری ہفتہ میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی طلائی جوبلی منائی گئی، جس کے شعبہ علوم وفنون اسلامی صدارت سید صاحب نے کی، اس میں خطبۂ صدارت کے علاوہ اپنا ایک مقالہ "عرب اور امریکہ" کے عنوان سے پیش کیا۔ اگست میں انجمن ترقی اردو بہار کے زیر اہتمام جلسہ میں شریک ہوئے۔ نومبر میں جامعہ دار العلوم عمر آباد میں جلسہ تقسیم اسناد کی صدارت کی اور نہایت پر مغز تقریر کی اور حیدر آباد کا سفر کیا اور ایک علمی مجلس میں ابوالبرکات بغدادی کی کتاب المعتبر ایک مضمون پڑھا۔

۱۹۳۸ء=۵۸-۱۳۵۷ھ: نومبر میں سیرۃ النبی جلد ششم کی اشاعت عمل میں آئی۔ اسی سال ودیا مندر اور واردھا اسکیم پیش کی گئی تو اس کے خلاف سخت صدائے احتجاج بلند کی۔

۱۹۳۹ء=۵۹-۱۳۵۸ھ: اگست میں سید صاحب نے راہ سلوک اختیار کیا اور مولانا تھانوی سے بیعت کی درخواست کی لکھنؤ میں مولانا تھانویؒ نے بیعت سے سرفراز فرمایا۔ دسمبر میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ جلسہ کلکتہ میں ہوا جس کی صدارت نواب کمال یار جنگ بہادر جاگیردار حیدر آباد نے کی، سید صاحب نے اس کے شعبۂ اردو کی صدارت فرمائی۔

۱۹۴۰ء=۶۰-۱۳۵۹ھ: جنوری میں سید صاحب حیدر آباد، پونا اور بمبئی گئے جہاں مختلف اداروں، کالجوں، مدرسوں کا معائنہ کیا، طلبہ کو خطاب کیا اور اساتذہ سے تبادلۂ خیال

کیا۔ الندوہ کو دوبارہ جاری کیا۔ ۱۳/فروری کو مہاتما گاندھی جی نے سید صاحب کو خط لکھ کر ہندوستانی پرچار سبھا کی کانفرنس کی دعوت دی، مارچ میں پشاور، بھاگلپور اور لاہور کا سفر کیا، ۸/مارچ کو پشاور پہنچے، قیام ناظم شعبہ دینیات اسلامیہ کالج جناب نور الحق ندوی پشاوری کے یہاں کیا، دینیات اور طب کے نصاب کی ترتیب دی۔ ۹/مارچ کو کالج کے طلبہ اور اساتذہ کو خطاب کیا۔ ۱۱/مارچ کو ایک بار پھر کالج کے اساتذہ اور طلبہ کو مخاطب کیا اور پُر زور الفاظ میں کہا: ''مسلمانوں کی اکثریت کے ان صوبوں میں کالج کے مسلمان طلبہ کو ایمان وعمل کا ایسا نمونہ پیش کرنا چاہئے کہ پورے ہندوستان کے مسلمان اس کی تقلید کریں۔ ۱۲/مارچ کی صبح کو بھاولپور سے روانہ ہوئے۔ ۱۴/مارچ کو صادق ایجرٹیرین کالج کے جلسہ تقسیم اسناد میں خطبہ پڑھا۔ ۱۵/مارچ کو کالج ہال میں خصائص اسلامی پر تقریر کی اور جمعہ کو جامع مسجد میں فضائل نبوی پر تقریر کی، اسی سال رحمت عالم شائع ہوئی اور حیات شبلی کا کام شروع کیا۔

۱۹۴۱ء=۴۲-۱۳۶۱ھ: نواب صاحب چھتاری کی صدارت میں اسلام کے سیاسی نظام کی تدوین کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی، سید صاحب کو اس کا کنوینر بنایا گیا۔

۱۹۴۲ء=۴۳-۱۳۶۲ھ: ۲۲/اکتوبر کو مولانا تھانویؒ نے سید والا مرتبت کو سلاسل اربعہ میں خلافت باطنی عطا فرمائی۔ فروری ۱۹۴۳ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے سید صاحب کی علمی وادبی خدمات کے اعتراف میں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری پیش کی، اس خوشی کے موقع پر اہل دسنہ نے ان کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا۔ ۲۰، ۱۹/جولائی کی درمیانی رات میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے وفات پائی جس کی اطلاع سید صاحب کو بعد میں ہوئی انہیں بے حد رنج ہوا، اپنی دلی کیفیات کا اظہار انہوں نے اپنی نظم ''رحلت شیخ'' میں کیا۔

۱۹۴۳ء=۴۴-۱۳۶۳ھ: فروری میں حیات شبلی شائع ہوئی۔ دسمبر کو ہسٹاریکل کانگریس کے اجلاس کے شعبہ تاریخ ازمنہ وسطی ہند منعقدہ مدراس کی صدارت کی۔ اسی سفر میں مدراس کے دوسرے مقامات میں بھی ان کی تقریریں ہوئیں، میل ویشارم میں تقریر کا عنوان ''ملت محمدیہ کی حقیقت'' اور دارالسلام عمرآباد میں ''عبدیت'' تھا۔ دارالسلام کی مسجد میں

دور زور تک صبح کے وقت درس قرآن دیا، مدراس سے بمبئی تشریف لے گئے تو وہاں کی جمعیۃ العلماء کی دعوت پر سورۃ الحمد کی تفسیر کے ضمن میں مسلمانوں کے حال پر تبصرہ فرمایا، شہر کی انجمن اسلام ہال میں ''اردو'' اور صابو صدیق ہال میں ہندوستان میں علوم عربیہ کی خدمت پر تقریریں کیں، گاندھی جی کی دعوت پر وار دھا سفر فرمایا اور اردو کے مسئلے پر اپنی رائے دی۔

۱۹۴۵ء = ۶۵-۱۳۶۴ھ: فروری میں جمعیۃ العلماء صوبہ بمبئی کے اجلاس کی صدارت کی اور اپنے خطبہ میں بمبئی کے مسلمانوں کو ایک مسلم آزاد مدرسہ کے قیام کی طرف توجہ دلائی۔ جولائی میں راندیر کے جامعہ حسینیہ اور مدرسہ اشرفیہ کی دعوت پر وہاں تشریف لے گئے اور جامعہ حسینیہ میں "الجهد والجهاد لعلمی المعاش والمعاد" کے عنوان سے اور مدرسہ اشرفیہ میں خشیت الٰہی پر خطبہ دیا، نیز سورت، ڈابھیل اور بمبئی کا سفر ہوا۔

۱۹۴۶ء = ۶۶-۱۳۶۵ھ: جون میں سید صاحب نے ریاست بھوپال میں قاضی القضاۃ اور امیر جامعہ شرقیہ (ڈائرکٹر تعلیمات علوم مشرقی) کا عہدہ قبول کیا۔

۱۹۴۹ء = ۷۰-۱۳۶۹ھ: ۱۶/جولائی کو انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس بھوپال میں شرکت کی۔ اکتوبر میں حج کے لئے روانہ ہوئے، مکہ میں رباط بھوپال میں قیام کا انتظام تھا، لیکن سلطان عبدالعزیز بن سعود نے اس کو پسند نہیں کیا اور اپنا خاص مہمان بنایا۔ ۱۵/دسمبر کو جدہ سے واپسی ہوئی۔

۱۹۵۰ء = ۷۱-۱۳۷۰ھ: جنوری میں حج کے بعد بھوپال واپسی ہوئی۔ یکم جون کو تقریباً پانچ ماہ بعد بھوپال سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئے۔ ۱۱/جون کو دہلی سے خیر سگالی وفد کی پرمٹ پر لاہور کے لئے ہوائی جہاز سے روانہ ہوئے، دوپہر کو لاہور پہنچے۔ ۲۴/جون کو کراچی پہنچے اور ہندوستان سے ہجرت کر گئے۔ دسمبر میں انجمن ترقی اردو پاکستان نے سید صاحب کے اعزاز میں ڈاکٹر محمود حسین مرکزی وزیر کی صدارت میں ایک جلسہ کیا جس میں سید صاحب نے "ہندوستان کے نو مسلم حکمرانوں" کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔ دسمبر میں سید صاحب کی صدارت میں اسلامی دستور کا خاکہ ترتیب دیا گیا جس میں ۳۱/علماء شریک ہوئے۔

۱۹۵۱ء=۷۱-۱۳۷۰ھ: جنوری میں جمعیۃ علمائے اسلام سلہٹ کے جلسہ کی صدارت کی۔فروری میں احتفال علماء اسلام کے نام سے اسلامی ملکوں کے علماء کی کانفرنس ہوئی جس میں سید صاحب نے نمایاں حصہ لیا،موتمر میں شرکت،ملتان کے تبلیغی اجتماع میں شرکت،قائداعظم کی یادگار مجوزہ دارالعلوم کی رکنیت اور مختلف علاقوں کا سفر،دستور ساز اسمبلی کی صدارت،مارچ میں ابن سینا کی ہزار سالہ یادگار میں شرکت کے لئے حکومت عراق نے سید صاحب کو دعوت نامہ بھیجا لیکن بعض مجبوریوں کی بنا پر سفر نہ ہوسکا۔مصر کے المجمع العلمی الادبی قائم ہوئی میں سید صاحب کو بحیثیت رکن منتخب کیا گیا،اسی سال آل پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی قائم ہوئی تو سید صاحب اس کے رکن منتخب ہوئے۔

۱۹۵۲ء=۷۲-۱۳۷۱ھ: مارچ میں لاہور میں پاکستان ہسٹاریکل کانفرنس کے شعبہ اسلامی تاریخ کی صدارت کی اور اس میں ایک مقالہ بھی ''دیبل'' کے عنوان سے پیش کیا،وہاں عربی زبان وادب کی بھی صدارت فرمائی،پنجاب یونیورسٹی میں ان کا ایک توسیعی لکچر بھی ہوا۔اسی سال عرب ممالک کی سب سے بڑی علمی اکیڈمی مجمع الفوادالاول نے ان کو اپنا رکن بنایا۔اپریل کا پورا مہینہ ملتان اور راولپنڈی میں گذرا،یہاں عربی مدارس کے سالانہ جلسے ہوتے رہے،ان کی تنظیم کے لئے مفید مشورے دئے۔اسی سال کراچی یونیورسٹی قائم ہوئی تو سید صاحب اس کے سینٹ ممبر منتخب ہوئے۔اگست میں ادارہ تعلیمات اسلام کی صدارت قبول کی۔اسی سال کے آخر میں جمعیۃ اسلام کے صدر مقرر ہوئے۔

۱۹۵۳ء=۷۳-۱۳۷۲ھ: مارچ میں پاکستان ہسٹاریکل کانفرنس کی صدارت کے لئے ڈھاکہ تشریف لے گئے اور کانفرنس کی صدارت کی،وہاں سے فتح پور ہسوہ آئے،چند روز کے بعد لکھنؤ پہنچے اور ندوہ کے جلسہ میں شریک ہوئے۔اپریل میں کراچی واپس پہنچے،کچھ ہی دن کے بعد تنفس کا دورہ پڑا،علاج سے صحت یاب ہوگئے۔۲۲/نومبر کو شام کے ساڑھے چھ بجے روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔۲۳/نومبر کو نیوٹاون مسجد کے وسیع احاطہ میں ڈاکٹر عبدالحی صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے پہلو میں تدفین ہوئی۔

آج کے ادبی تقاضے

حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ

نوجوان ادیبو! اور ہندوستان کی زبان اور قلم کے مالکو!!

خوشی کی بات ہے کہ آج ایسے موقع پر جب لوگ سیاسی اور راج نیتک جھگڑوں میں پھنسے ہیں، چند ایسے لوگ بھی ہیں جوان سے اونچی باتوں کو سوچنے اور سمجھنے کے لیے بھوپال کے ترقی پسند اہل قلم کے بلاوے پہ یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔ ترقی پسند اہل قلم کیا کہتے ہیں اور کیا بلاوا دیتے ہیں اور ان کے دل میں کیا ہے اور یہ کیا چاہتے ہیں، اس کے متعلق کچھ اچھی اور کچھ بری باتیں میں نے سنی ہیں۔ لیکن خود میری زندگی کا یہ پہلا موقع ہے کہ میں اس میں شریک ہو رہا ہوں۔

زبان اور قلم کی قوت اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔ یہ نعمت جس کو ملی ہے حق ہے کہ وہ اس کی قدر کرے اور اس قوت کو وہ ان کاموں میں صرف کرے جن سے مخلوقاتِ الٰہی کو فائدہ پہنچے۔ جن سے سچائی ابھرے اور جھوٹ نیچے ہو، جن سے نیکی پروان چڑھے اور بدی پست ہو، جن سے اچھائی پھیلے اور برائی دبے۔ جن سے دیس والوں میں بلکہ دنیا کے بسنے والوں میں میل ملاپ ہو، انسانی بھائی چارہ اور امن و امان اور شانتی پیدا ہو، لڑائی کا چرچا بند کیا جائے۔ لوگوں کے دلوں سے انسانوں سے نفرت کرنے کا جذبہ مٹے اور اس کی جگہ پر بروں سے نفرت کی جائے، برائی سے نفرت اور بروں سے ہمدردی کی جائے اور ان کے ساتھ ہمدردی یہی ہے کہ ان کو برائی کی برائی بتائی اور سمجھائی جائے اور جس طرح بیماروں کو نہیں بلکہ بیماری کو ہم ناپسند کرتے ہیں اور بیماروں سے ہمدردی کرتے ہیں اور ان کی خدمت اور تیمارداری کرتے ہیں، راہ سے بھٹکے ہوؤں اور راہ میں دھوکا کھانے والوں کی

خدمت کر کے اور ان کے دلوں میں اپنی محبت پیدا کر کے ان کو سیدھی راہ سمجھائیں۔

ساری دنیا لڑائی کے زخموں سے چور ہوگئی ہے۔ قوم کی قوم پر چڑھائی، دیس کی دیس سے دشمنی اور نسل کی نسل سے نفرت نے انسانیت کے جسم کو لہولہان کر دیا ہے۔ پچھلی دنوں لڑائیوں میں جو کچھ ہوا اس کو کون نہیں جانتا۔ خود اس ملک میں بسنے والوں نے انسان ہو کر جانوروں سے بھی بڑھ کر جو کام کیے وہ ہندوستان کی عزت کی آنکھوں کو جھکانے کے لیے کافی ہیں۔ آج بھی انڈونیشیا اور دکھنی افریقہ میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ انسانیت کے لیے شرم ہے۔ امپریلزم یا سامراجی اور شہنشاہی کا دور کہتے ہیں کہ ختم ہو گیا۔ لیکن ہم غور سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ صورت بدل گئی ہے، سیرت وہی ہے اور سرمایہ داری اور مزدوری کے جھگڑے اسی کی دوسری شکل ہیں۔

نوجوان ادیبوں اور شاعروں سے مجھے یہ کہنا ہے کہ آپ اپنی زبان اور قلم کو آگ کے لگانے میں نہیں، بلکہ اس کے بجھانے کے کام میں لائیں۔ آپ اپنے میٹھے بول اور سریلے گیتوں سے غم سے بھرے ہوئے دلوں کو تسکین کا پیام دیجیے۔ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑیے اور محبت کی گھلاوٹ سے نفرت کی تلخی کو دور کیجیے۔ چین اور برما میں جو کچھ ہو رہا ہے کیا اس سے ہماری آنکھیں نہیں کھلتیں۔

میں نے ترقی پسند ادیبوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ ہمارا ادب ہماری زندگی کا ساتھ دے۔ یہ بات بالکل ٹھیک ہے، جن لوگوں کی نظر مختلف ملکوں کی ادب کی تاریخ پر ہے وہ جانتے ہیں کہ آج ہی نہیں بلکہ ہمیشہ سے ہر قوم کے ہر زمانہ کا ادب اس کی زندگی کی تصویر ہوتی ہے بلکہ قوم اور اس کے زمانہ کے ادب کو پڑھ کر بالکل ممکن ہے کہ ہم اس قوم کی دماغی، ذہنی، تمدنی اور اخلاقی زندگی کا پتہ پالیں۔ کیا شاہنامہ اور فرخی، عنصری وغیرہ کے دیوان نہیں بتاتے کہ سلطان محمود کے عہد میں اس کی مملکت کی کیا فضا تھی اور کیسی عسکریت چھائی ہوئی تھی۔ کیا اندر سبھا، امانت، فسانہ عجائب، طلسم ہوش رُبا، چار درویش، آرائش محفل، دیوان انشاء، دیوان رنگین، دیوان جان صاحب نہیں بتاتے کہ اس عہد کے لوگ کس تمدن کے رنگ و بو اور

خیالات واوہام میں پرورش پارہے تھے۔ پھر کیا حالی، اکبر، اسماعیل میرٹھی اور شبلی کا کلام، اصلاح وتجدید اور احساس کا پیغام نہیں اور کیا اقبال کا کلام نئی تعلیم اور نئے خیالات کا پیغامبر نہیں۔ زمانہ بظاہر بے زبان ہے مگر حقیقت میں بے زبان نہیں۔ اس کے زمانے کا شاعر، ادیب اور مصنف اس کی زبان ہے، اور اسی زبان سے وہ اپنا حال دنیا والوں کو سناتا ہے۔ اس لیے آج کے نوجوان ادیب جب اپنے زمانہ کے خیالات کی ترجمانی کرنا چاہیں تو یہ دنیا کا کوئی نیا واقعہ نہیں۔ یوں ہی ہوا ہے، یوں ہی ہوتا آیا ہے اور یوں ہی ہوتا رہے گا۔ ہمارے نوجوان ادیب میری آج کی شکل وصورت کو دیکھ کر اور خیالات کو سن کر دل میں یہ کہتے ہوں گے ؎

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو......

خضر کیا جانے غریب اگلے زمانے والے

لیکن واقعہ یہ نہیں ہے۔ کبھی میں بھی جوان تھا اور کبھی میں بھی نوجوان ادیب تھا۔ اس وقت کے بوڑھے مجھے دیکھ کر اور میری باتیں سن کر اسی قسم کے اعتراضات مجھ پر بھی کرتے تھے۔ آخر میں بھی پرانا ہوا اور ان کی عمر کو پہنچا تو مجھے اپنے نوجوان کے نئے تیور دیکھ کر ویسا ہی تعجب آتا ہے۔ غالب کا ایک لطیفہ یاد آیا، غالب نے اپنے کسی شاگرد کو لکھا تھا، تمہاری گوری رنگت دیکھ کر مجھے رشک نہیں آیا کیوں کہ جب میں بھی جوان تھا تو میرا رنگ بھی چمپئی تھا۔ نوجوانو!

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔۔

میری سنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہے

میری قلمی خدمت کو نصف صدی گزر چکی ہے۔ ۱۹۰۱ء کے ''مخزن'' سے میری قلمی خدمت کا آغاز ہوا تھا۔ یہ مخزن نئے ادیبوں اور نئے شاعروں کے جذبات اور ولولوں کو لے کر نکلا لیکن آج وہ سارے ادیب وشاعر پرانے ہوچکے اور اب نئے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کی دنیا ہے۔ لیکن عزیزو! ایک دن تم کو بھی پرانا بننا ہوگا اور تمہارا ترقی پسند ادب بھی پرانا ہو چکا ہوگا اس لیے نیا اور پرانا ہونا تو کوئی خاص برائی کی بات نہیں۔ نہ ہر پرانی چیز غلط ہے اور نہ ہر نئی چیز ٹھیک ہے۔ اس غلط اور ٹھیک ہونے کی کسوٹی اس کی

افادیت ہے۔ مولانا روم اور سعدی و حافظ کا نام اب بھی زندہ ہے۔ مہابھارت اور رامائن پرانے نہ ہوں گے۔ گیتا آج بھی زندہ ہے اور قوموں کو زندگی دے رہا ہے۔

ہر قوم کا اعلیٰ ادب وہی ہے جس نے اس کو زندگی بخشی ہے اور اب بھی وہی ہوگا جو اس کو زندگی بخشے گا۔ سندھی کی کافی، پنجابی کی گرنتھ صاحب، ہندی میں گیتا اور کبیر کا کلام، بنگالی کی ٹیگور اور اردو میں اقبال ادب کے وہ نمونے ہیں جنھوں نے نئے خیالات بخشے اور نئی زندگی پیدا کی۔

حضرات! اس نئی ترقی پسند تحریک کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کی بنیاد سوشلزم یا کمیونزم پر ہے اور ترقی پسند نوجوانوں کے متعلق لوگوں میں اور بھی بدگمانیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان بدگمانیوں کی وجہ سے ان میں سے بعض کی زبان اور ادب کے اصول اور قواعد سے بے پروائی اور خیال و شعور میں بے اعتدالی اور اس کے اظہار خیال میں فخر پسندانہ بے باکی ہے۔ لیکن آپ نے دیکھا ہوگا کہ اب ترقی پسند نوجوان اپنی غلطی کو محسوس کرنے لگا ہے اور اب اس کو دور کرنا چاہتا ہے۔ نوجوانوں کی زندگی کے ہر شعبہ میں شروع شروع یہی حال ہوتا ہے، وہ غلطیاں کرتا اور ان غلطیوں کے کرنے میں بے باک ہوتا ہے اور جدت کے شوق میں اپنے لیے نئی راہیں نکالنا چاہتا ہے۔ لیکن تجربے کے بعد ٹھوکریں کھا کر سنبھل جاتا ہے اور اپنی غلطی محسوس کرتا ہے اور اس کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ شروع میں وہ یہاں تک اعتدال سے باہر تھا کہ فن سے بھی آزاد، اصولوں سے بھی آزاد اور محاوروں سے بھی آزاد تھا۔ لیکن اب اس کی آزادی ایک ایک کر کے دور ہوتی جارہی ہے۔ پچھلے چند سالوں کی اس تحریک پر نظر ڈالیے تو میرے اس بیان کی تصدیق ہوگی۔ یہاں پر ایک نکتہ سمجھنے کے قابل ہے۔ اہل تحقیق کے نزدیک شاعر اور مقرر میں بڑا فرق ہے۔ شاعر اپنی کہتا ہے اور خطیب دوسروں کی ترجمانی کرتا ہے، شاعر اپنے خیالات اور اپنے جذبات کو پیش کرتا ہے۔ وہ اپنے میں آپ مست ہوتا ہے اور اس کو دوسروں کی خبر نہیں ہوتی ہے۔ خطیب اور مقرر دوسروں کے خیالات اور دوسروں کے جذبات ابھارنے کا کام کرتے ہیں۔ اگر آپ غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جو خیالات حافظ کے ہیں اور جن کو انہوں نے اپنے اشعار میں بار بار ظاہر کیا ہے، وہ چند سے زیادہ نہیں۔ حافظ نے انہیں بار بار دہرایا ہے۔ خیام کی

رباعیاں پڑھیے، وہی چند خیالات خیام کے پاس ہیں جن کو وہ الٹ پلٹ کر کے کہتا ہے۔ صرف طرز ادا میں فرق ہوتا ہے۔ معنی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ یہی حالت موجودہ بڑے شاعروں کی ہے۔ ٹیگور کو دیکھیے وہی چند خیالات ہیں، وہی چند باتیں ہیں۔ اقبال کو اٹھا لیجیے وہی چند باتیں ملیں گی۔ یہ ان شعراء کا حال ہوتا ہے جو صاحب پیغام ہوتے ہیں، جن کے پاس چند حقائق ہوتے ہیں، جن کو وہ عمر بھر دہراتے رہتے ہیں۔ اور جن کی طرف وہ لوگوں کو دعوت دیتے ہیں۔ اور جن کے ماننے پر ان کے نزدیک دنیا کی صلاح وفلاح موقوف ہوتی ہے۔

حضرات! یقین دلیلوں سے نہیں پیدا ہوتا ہے بلکہ یہ بیان اور صاحب بیان کی سچائی سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ ہماری شاعری تکلفات سے سادہ اور مبالغوں سے خالی ہو اور جو بیان کیا جائے وہ شاعر کے دل کی بات ہو، وہ صرف محفل کی گرمی اور داد طلبی کے لیے نہ ہو، میں شاعر نہیں ہوں لیکن مجھے اپنا ایک شعر یاد آ گیا

اُدھر کہتا گیا وہ اور ادھر آتا گیا دل میں۔۔

اثر یہ ہو نہیں سکتا کسی دعوائے باطل میں

آپ میں سے جن لوگوں کو گاندھی جی کی تقریریں سننے کا موقع ملا ہو وہ جانتے ہیں کہ گاندھی جی اچھے مقرر نہیں تھے۔ گاندھی جی کا لہجہ اچھا نہیں تھا۔ ان کے ہندوستانی کے لفظ بھی ٹھیک نہیں ہوتے تھے لیکن اس کے باوجود بھی ہندوستانیوں نے ان کے قلم اور زبان سے کتنا فائدہ اٹھایا۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ جو کام گاندھی جی نے اس ملک میں کیا وہ کسی ملک میں انجام نہیں دیا گیا۔ دنیا کے دوسرے حصوں میں دیکھیے کیا ہو رہا ہے۔ چین کی خانہ جنگی نے اس کا کیا حال بنایا ہے، برما میں خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے۔ انڈونیشیا میں سیاسی مکاری اور چالبازی کا مظاہرہ ہو رہا ہے لیکن گاندھی جی نے ہندوستان میں جس خیال کو پیش کیا تھا۔ وہ سادہ عملی فلسفہ تھا۔ وہ محض جذبات نہ تھے، ان کا یہ فیصلہ اصول پر مبنی ہے۔ ان کا یہی فلسفہ ہے جس نے ہندوستان کو آزاد کرایا۔ جس کے ذریعہ وہ ملک میں امن وامان پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اگر ملک کے تمام فرقے سچائی کے ساتھ ان پر عمل کرتے اور اس میں

اتفاق نہ برتتے تو اتنا بھی نہ ہوتا جتنا ہندوستان میں ہوا جس پر سب کو افسوس ہے۔

ہمارے ادیبوں اور شاعروں کا فرض ہے کہ ملک کی خاطر کام کریں اور باہمی اتحاد کا پیام عام کریں۔ وہ طبقات کی نفرت کے بجائے لوگوں کو محبت کا پیام سنائیں۔ ان کی شاعری صرف واہ واہ اور ہر قدیم کی بیخ کنی اور ہر پرانی بات کی توہین نہ ہو۔ غرض کہ ان کی شاعری کا مقصد تعمیر ہو، تخریب نہ ہو۔ نئی شاعری کے نئے انداز اور نئی پرواز اور نئے تقاضوں سے ہم کو انکار نہیں، نہ ہم کو سرمایہ داری کی مذمت، کسانوں اور مزدوروں کی مظلومی کی داستان سے انکار ہے لیکن ضرورت یہ ہے کہ دہقان کے پسینہ کی بربادی اور غریبوں کی تباہی پر ہمدردی ہو۔ صرف محفل کی گرمی کے لیے مزدور، کھیت، کسان، دہقان، جھونپڑی کا تذکرہ نہ ہو۔ ورنہ یہی کہا جائے گا کہ جس طرح اگلے شعرا گل و بلبل سے اپنا مطلب ادا کرتے تھے۔ اسی طرح آج دہقان، کھیت اور مزدور سے مقصد کو ادا کیا جا رہا ہے۔ حقیقت نہ وہاں تھی نہ یہاں۔

حضرات! یہی چند باتیں تھیں جن کو اختصار کے ساتھ مجھے آپ کے سامنے پیش کرنا تھا۔ ابھی ہم کو اپنے نئے ادب کی تعمیر کے لیے جو ملت کی بھی تعمیر کا سبب ہے، بہت کام کرنا ہے۔

نوجوانو! قدم آگے بڑھاؤ، زمانے کی قوت تمہارے ساتھ ساتھ ہے۔ بایں ہمہ اپنے وقت کے بوڑھوں کے تجربوں سے بھی فائدہ اٹھاؤ۔ بوڑھے حافظؔ کا مشورہ ہے ؎

نصیحت گوش کن جاناں کہ از جاں دوست تر دارند......

جوانانِ سعادت مند پند پیر دانا را

ان مختصر لفظوں پر میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں اور اپنے عزیز مہمانوں کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ (شمارہ ۳، ۱-۱۹۴۹ء)

ترقی پسند تحریک کے اجلاس میں سید صاحب کی شرکت

۲۵ جنوری ۱۹۴۹ء انجمن ترقی پسند کی کانفرنس بھوپال میں منعقد ہوئی جس کی روداد بیان کرتے ہوئے صفیہ اختر لکھتی ہیں:

"۲۵ جنوری کو سات بجے شام کانفرنس کا افتتاحیہ اجلاس ہونا تھا، تمام دن ہال سجایا جاتا رہا، مرکزی سائن بورڈ شانداری سے پورے ہال میں جگمگا رہا تھا، تصویریں وغیرہ بھی بقول شخصے وقت کو دیکھتے ہوئے بری نہ تھیں، منٹو ہال کے عالی شان ستون، نقشیں، محرابیں، بلند و مرصع چھتیں بذات خود مرعوب کن ہیں، آج کی سجاوٹ نے ہال میں زندگی کی لہری دوڑا دی تھی، والنٹیرز اپنے نشانوں سمیت ہر سمت خراماں نظر آرہے تھے، ادھر استقبالیہ کمیٹی کے ممبروں کے سینوں پر سجے ہوئے خوش رنگ نشان ان کے دل کی دھڑکن کی غمازی کر رہے تھے، موٹروں پر موٹریں آکر رکیں، اور دیکھتے دیکھتے ہال بھر گیا، جلسے کی صدارت کا اعلان کیا گیا، اور بائیں پہلو کی کرسیوں کی قطار سے کرشن چندر نکل کر اسٹیج کی طرف بڑھے...........کرشن چندر کی فرمائش پر مولانا صاحب (مولانا سید سلیمان ندوی) اسٹیج پر تشریف لائے، نہایت نفیس ململ کا سفید عمامہ سر پر اور اس سے بھی زیادہ سفید داڑھی ان کے دمکتے چہرے پر زیب دے رہی تھی، مولانا کا قد وقامت بلند نہیں، مگر ان کے کشیدہ پن میں بڑھاپے کے ساتھ بھی فرق نہیں آیا، ان کے بشرے سے مسلمانوں کی عظمت رفتہ مترشح نظر آتی ہے، ان کی چال ڈھال میں ایک عالمانہ وقار ہے، اور ان کے تیور میں ایک محقق کا ٹھوس پن۔

"نوجوان ادیبو اور ہندستان کی زبان اور قلم کے مالکو!" مولانا نے مخاطب کیا، ان کا انداز کچھ عمر کے تقاضے اور کچھ فطری آہستہ کلامی کی وجہ سے گرمی گفتار سے محروم ہے، وہ ٹھنڈے دل سے آواز کی معین سطح پر بولتے رہے، سننے اور سمجھنے کا فرض حاضرین کے ذمہ رہا، "کبھی میں بھی نوجوان ادیب تھا" مولانا نے فرمایا "اس وقت کے بوڑھے مجھے دیکھ کر اور میری باتیں سن کر اس قسم کے

اعتراضات مجھ پر بھی کرتے تھے، آخر میں بھی پرانا ہوا اور ان کی عمر کو پہنچا تو مجھے بھی اپنے نوجوانوں کے تیور دیکھ کر ویسا ہی تعجب آتا ہے۔ اب نئے ترقی پسندوں کی دنیا ہے، لیکن عزیزو! ایک دن تم کو بھی پرانا بننا ہوگا، اور تمھارا ترقی پسند ادب بھی پرانا ہو چکا ہوگا، اس لئے نیا اور پرانا ہونا کوئی خاص برائی کی بات نہیں، نہ ہر پرانی چیز غلط اور نہ ہر نئی چیز ٹھیک ہے، اس کے غلط اور ٹھیک ہونے کی کسوٹی اس کی افادیت ہے" ان الفاظ سے مولانا نے ادب کے متعلق ایک ارتقائی نظریہ پیش کیا اور ترقی پسندی کے نام سے عام طور پر جو تعصبات وابستہ ہیں ان کا ازالہ کیا۔"

(ایک ہنگامہ، صفیہ اختر افکار بھوپال، خاص نمبر ۱۹۴۹ء ص ۱۱۔۱۲ بحوالہ یادگار سلیمان عبدالقوی دسنوی)

تعارف: یونائیٹڈ ویلفیر ایسوسی ایشن

یہ تنظیم استھانواں بہار شریف نالندہ کے چند نوجوانوں کی کوشش سے آٹھ دس سال قبل وجود میں آئی، بنیادی طور پر اس کا مقصد بستی اور علاقہ میں رفاہی فلاحی کام اور تعلیمی ترقی کے علاوہ غریب طلبہ کا تعاون اور امداد ہے جس میں وہ سرگرم عمل ہے اور اب تک اس میدان میں قابل قدر کام انجام دے چکی ہے۔ اور اس کا سلسلہ جاری ہے، ہر سال اس کا سالانہ اجلاس ہوتا ہے جس میں علاقہ اور بستی کے کامیاب طلبہ کو جو بورڈ کے امتحانات میں کامیابی حاصل کرتے ہیں انعامات سے نوازا جاتا ہے نیز جو غریب ہوتے ہیں ان کو آگے تعلیم جاری رکھنے کے لئے وظیفہ بھی دیا جاتا ہے۔ علاقہ کے بزرگوں کے آثار وباقیات کے اشاعت اور علمی ذوق کا فروغ بھی اس کے مقاصد میں شامل ہے غرض اس نو خیز تنظیم کے مقاصد بلند ہیں جس کی تکمیل میں وہ حسب وسعت وگنجائش کوشاں ہے۔ اس کے سرگرم صدر جناب ضیاء الحق شرفی ایک جواں سال انجینئر ہیں اور دیگر اراکین بھی عصری تعلیم یافتہ اور باذوق ہیں۔ اصلاح معاشرہ کا کام بھی اس کے پیش نظر ہے جس کے لئے اس نے کچھ قدم بڑھائے ہیں۔ اللہ تعالی اس کے مقاصد میں اسے کامیابی نصیب فرمائے۔ اسی نوخیز تنظیم نے اس سیمینار کے انعقاد کا بار گراں اپنے کاندھوں پر اٹھایا۔

ندوۃ العلماء کا امتیاز

ملک میں چھوٹی بڑی سیکڑوں دینی درسگاہوں کے ہوتے ندوہ نے ایک نیا ''دارالعلوم'' قائم کر کے دینی تعلیم وتربیت کے جن نئے مقاصد کا بیڑا اٹھایا تھا، ان میں سب سے نمایاں وقت کا ایک اہم دینی مطالبہ ایسے علماء کا پیدا کرنا تھا، جو عصری تقاضوں اور علوم وفنون سے آگاہ ہوں، اور ان کے مقابلہ میں دین کی علمی وعملی خدمات کا حق ادا کر سکیں، اس مقصد عظیم خصوصا جدید علوم وفنون کی تعلیم کے لئے جیسا سامان، سرمایہ درکار تھا، ندوہ کو کبھی میسر نہ آیا، بے سروسامانی کے دیکھتے، اس نے طلبہ میں نفس مقصد کی روح پھونکنے میں جتنی کامیابی حاصل کی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ظاہری سازوسامان بھی اگر کسی معتد بہ درجہ میں فراہم ہوتا تو اسلامی نقطہ نظر سے دینی ہی نہیں، دنیوی یا سیاسی وقومی قیادت کا مرکز ہندوستان کیا شاید سارے عالم اسلامی کا آج ندوہ ہی ہوتا۔

(حضرت مولانا عبدالباری ندویؒ)

بانیان ندوۃ العلماء کی روشن ضمیری

ندوہ کے بانیوں کی روشن ضمیری محتاج ثبوت نہیں رہی، ہرچند کہ قدیم وجدید اور عقل ونقل کا امتزاج اس اعلی معیار کے مطابق نہ ہوسکا جو ندوہ کے بانیوں کے پیش نظر تھا، مگر محدود تجربے نے بھی مقصد کی صداقت عیاں کردی اور اس کے فرزندوں کی عملی مثال نے دوسرے رہ نوردوں کے لئے راہ عمل نمایاں کردی، فکرونظر کے گوشے ہوں یا درس وتدریس کی مسندیں، جلوت کے ہنگامے ہوں یا خلوت کے حلقے، اخبارات ورسائل کے مقالے ہوں یا ذکروشغل کے مشغلے، سیاست کی پرخاروادیاں ہوں یا معیشت کی پرپیچ راہیں، ادب کے گیسوؤں کی آرائش ہو یا علم وحکمت کی غواصی، کون سا کام منتسبین ندوہ کے نام سے خالی ہے، کس میدان میں اس کے قدم نہیں پہنچے، کون سی وادی ان رہ نوردان شوق سے ناآشنا ہے، اور ان کے نقش پا کی شوخی کس منزل پر پکار پکار کر یہ اعلان نہیں کررہی۔

ابھی گذرا ہے کوئی اس طرف سے

(مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ)

سیمینار پر ایک نظر
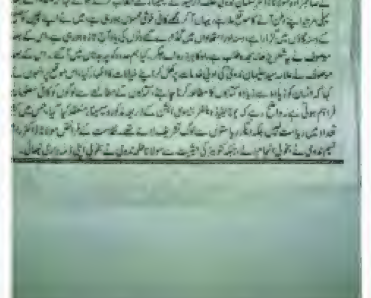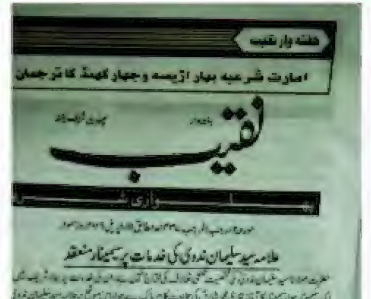
سپاسنامہ

بخدمت مخدومنا حضرت مولانا ڈاکٹر سید سلمان ندوی دامت برکاتہم

سابق صدر شعبۂ اسلامیات، ڈربن یونیورسٹی ڈربن ساؤتھ افریقہ۔

بموقعہ تشریف آوری بہار شریف نالندہ

مخدومی وسیدی!

آج کا دن ہم سب کے لئے باعث صد افتخار، اور اس تاریخی سرزمین کے لئے سرمایۂ نازش ہے، اس وقت کی یہ ساعت ہماری خوش بختی وخوش نصیبی کا دیباچہ ہے جس میں آپ کے ورود مسعود اور آمد پر بہار سے ہمارے دل فرحت وانبساط اور شادمانی ومسرت کے جذبات سے معمور اور تشکر وامتنان کی کیفیت سے سرشار ہیں، جس کے اظہار کے لئے ہمارے پاس الفاظ نہیں۔

اے آمدنت باعث خوش بختی ما!

اس سرزمین میں ان شاء اللہ آپ کی یہ تشریف آوری اور آمد نازورود صد بہاراں کا نقطۂ آغاز اور ہزاروں خوشیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔

آمدی سوائے گلستاں کہ بہار آمد شد　　　غنچہ وگل وبلبل را قرار آمد شد

میرے معزز مہمان!

اپنی اس ذرہ نوازی اور خورد نوازی پر ہم کس طرح آپ کا شکریہ ادا کریں کہ آپ نے ازراہ شفقت ومحبت ہماری حقیر دعوت کو قبول فرماکر اور اپنی بے پناہ مشغولیات کے ہجوم میں یہاں تشریف لاکر ہماری ہمت افزائی فرمائی

مخدوم ما!

یقیناً اس خطہ سے آپ کا خاک وخون کا تعلق رہا ہے، زندگی کے ابتدائی مرحلہ میں اس کی خاک نے آپ کے قدم کے بوسے لئے ہوں گے، اور اپنی اس سعادت پر وہ کس قدر نازاں ہوگی اور دعا گو ہوگی کہ اس کی آغوش محبت میں پرورش پانے والا یہ فرزند بھی اپنے عظیم والد ہی کی طرح اقلیم علم وفن کا تاجدار ہو، اور آج ایک طویل جدائی کے بعد جب کہ اس نے اپنے تخیل تمنا کے برگ وبار دیکھ رہی ہے اپنے اس عظیم سپوت کو دوبارہ اپنی آغوش میں دیکھ کر اس پر جس قدر نازاں وفرحاں ہو وہ کم ہے۔

حضرت عالی مرتبت!

آج پوری دنیا آپ کے علم وفن کا خراج پیش کر رہی ہے، دیگر علمی ادارے نسبت کی بنا پر آپ کا اعزاز کر رہے ہیں، لیکن ہمارا آپ سے والہانہ تعلق ومحبت نہ صرف عظیم نسبت کی بنا پر بلکہ خود آپ کی ذاتی امتیازات وخصوصیات کی بنا پر بھی ہے کہ آپ اس سرزمین عظیم المرتبت سلف کے عظیم سپوت اور ہماری سرزمین کے ایک قابل صد فخر فرزند ہیں، اس طرح ہمارا آپ سے صرف دماغ کا نہیں قلب کا رشتہ ہے۔

اس موقعہ پر ہم وہی الفاظ دہراتے ہیں جو آپ کے اہل وطن باشندگان دسنہ نے آپ کے فخر روزگار والد گرامی کو ہندوستان کی عظیم دانشگاہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی طرف سے اعزازی سند سے سرفرازی پر ہدیہ سپاس وکلمات تہنیت وتبریک پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

''یوں تو اسلامی وعلمی ہندوستان کی کون سی بلند ترین ہستی اور مجلس ہے جس نے آپ کی عزت افزائی کو اپنے لئے باعث وفخر نہیں سمجھا ہے، لیکن ان کی ساری عقیدت تمام تر دماغی رہی ہے، لیکن یہ عزت ہم کو اور صرف ہم کو حاصل ہے کہ ہماری عقیدت ہی نہیں بے پناہ محبت صرف دماغی نہیں بلکہ سرتاپہ روحانی ہے،۔۔۔ ہمارے پاس نہ نادر شاہ کا خزانہ ہے، نہ نظام دکن کی دولت، ہمارے پاس محبت اور صرف محبت کی پونجی ہے اور اس کو ہم نہایت خلوص کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور بارگاہ رب العزت میں دعا کرتے ہیں کہ الٰہی! اپنے اس چہیتے بندے کو قوم وملت کی رہنمائی ورہبری کے مواقع ہمیشہ عطا فرما، اور اس عظیم الشان شخصیت کو جو ہماری محبت والفت اور عقیدت کا مرکز ہے قائم ودائم رکھ، ایں دعا از ما واز جملہ جہاں آمین باد''۔

منجانب : یونائیٹیڈ ویلفیر ایسوسی ایشن استھانواں، نالندہ، بہار

سپاسنامہ

منجانب : ہومیوپیتھک ویلفیر ایسوسی ایشن استھانواں نالندہ بہار

سید کی شخصیت کے متعلق چند اہم کتابیں

سید صاحب کے اہم تلامذہ

سید صاحب کے ممتاز تلامذہ و مستفیدین

نمبر	نام	منصب
(۱)	مولانا عبد الرحمن نگرامی ندویؒ	شیخ الادب دار العلوم ندوۃ العلماء
(۲)	مولانا عبد الباری ندویؒ	صدر شعبہ فلسفہ قدیم و جدید عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد
(۳)	مولانا ابو الحسنات ندویؒ	رفیق دار المصنفین اعظم گڑھ
(۴)	مولانا عبد الرحمن کاشغری ندوی	صدر شعبہ عربی مدرسہ عالیہ کولکاتا
(۵)	مولانا [illegible] معین الدین [illegible] ندوی	رفیق دار المصنفین، پرنسپل [illegible] اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ
(۶)	مولانا شاہ معین الدین احمد ندویؒ	ناظم دار المصنفین، اعظم گڑھ
(۷)	مولانا محمد اویس نگرامی ندویؒ	شیخ التفسیر دار العلوم ندوۃ العلماء
(۸)	مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندویؒ	ناظم ندوۃ العلماء
(۹)	مولانا مسعود عالم ندویؒ	بانی دار العروبہ راولپنڈی، ایڈیٹر الضیاء، عربی مجلہ
(۱۰)	مولانا ریاست علی ندویؒ	پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ
(۱۱)	مولانا سید محمد ہاشم استھانوی ندویؒ	ناظم دائرۃ المعارف حیدرآباد
(۱۲)	سید نجیب اشرف دسنوی ندویؒ	پروفیسر اسمٰعیل یوسف کالج بمبئی
(۱۳)	سید رئیس احمد جعفری ندویؒ	ایڈیٹر روزنامہ خلافت بمبئی، و ماہنامہ ریاض کراچی
(۱۴)	مولانا ابو الجلال ندویؒ	رفیق دار المصنفین
(۱۵)	مولانا عبد القدوس ہاشمی ندویؒ	رفیق دائرۃ المعارف حیدرآباد
(۱۶)	مولانا ابو العرفان ندویؒ	استاد و مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء
(۱۷)	مولانا عبد السلام قدوائی ندویؒ	معتمد تعلیمات دار العلوم ندوۃ العلماء
(۱۸)	مولانا عمران خان ندویؒ	مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء
(۱۹)	مولانا محمد ناظم ندویؒ	شیخ الجامعۃ العباسیہ بہاولپور، پاکستان
(۲۰)	مولانا قاضی عبد الرؤف ندوی اورنگ آبادیؒ	قاضی شہر اورنگ آباد
(۲۱)	ڈاکٹر حمید اللہ حیدرآبادیؒ	عالم اسلام کے مشہور مورخ
(۲۲)	مولانا ابو سلمہ شفیع بہاری	مدرس مدرسہ عالیہ کولکاتا
(۲۳)	سید صباح الدین عبد الرحمنؒ	ناظم دار المصنفین، اعظم گڑھ
(۲۴)	مولانا مصطفیٰ کریم دسنوی ندویؒ	پروفیسر متھلا یونیورسٹی دربھنگہ
(۲۵)	سید مظفر الدین ندویؒ	
(۲۶)	مولانا مجیب اللہ ندویؒ	ناظم جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ

اے سلیماں!

مولانا سید سلیمان کی وفات حسرت آیات پر چند آنسو

از: حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی

"مولانا سید سلیمان ندوی کی وفات حسرت آیات کی خبر ۲۳ نومبر کو ملی، اسی دن سید صاحب مرحوم کے آبائی وطن دسنہ کے متصل استھانواں نامی مقام میں یہ تعزیتی نظم سنائی گئی"

مورد رنج ومحن

مناظر احسن گیلانی

(اخبار مدینہ بجنور ۹ دسمبر ۱۹۵۳ء)

اے سلیماں! آہ پیغمبر کا وہ سیرت نگار
جس پہ نازاں ہند تھا اور فخر کرتا تھا بہار

ہائے محفلِ علم کی افسوس سونی ہوگئی
دین ودانش کے چمن کی لٹ گئی گویا بہار

اب کرے گا کون ہم میں دین کے اسرار کو
کاوشِ تحقیق کی صیقل گری سے آشکار

خدمت بے مزد کرتا کون ہے اسلام کی
کس پہ ہوگا ملت کے اس عشق کا سودا سوار

تیرے علمی ذوق کی عربی زباں ممنون ہے
پیش کرتا ندوہ تھا تجھ کو بہ شکلِ شاہکار

گو پڑھا ندوہ میں تھا لیکن علی گڑھ، دیوبند
تیرے علم وفضل کا کرتے تھے دونوں اعتبار

ہند اور تاریخ اسلامی کے اسرار ورموز!
سو رہو تم بھی جہاں سویا تمہارا رازدار

خندہ زن یورپ تھا قرآنی قصص پر جہل سے
تیرے خامہ نے بتایا ان کا تاریخی وقار

چاک پردوں کو کرے گا کون استشراق کے
اس کی چالوں پر کرے گا خود اسی کو شرمسار

حوصلہ افزائیاں تیری، خدا بخشے تجھے
کتنے ناکارے بنے ان کی بدولت اہلِ کار

اپنی تحریروں میں خود میری نظر تجھ پر رہی
رائے کا تیری رہا دل کو ہمیشہ انتظار

آج ہیں مبہوت تیری راہ کے سارے رفیق
گم وہی ہے ان میں جو تھا سب سے بہتر شہسوار

کھوئے کھوئے ان دنوں ہیں جوش بھی اور ہوش بھی
حضرت امجد بھی چپ ہیں اور جگر بھی دل فگار

خلق تیرا، حلم تیرا، تیرا شرمیلا مزاج
یاد میں ان کی رہیں گی اپنی آنکھیں اشکبار

فتنہ ہائے نو بہ نو سے ہوگیا آزاد تو
بے قراری میں بھی اک چیز ہے وجہ قرار

جن کے تو قابل نہ تھا ان سے ملی تجھ کو نجات
وہ بھی ہلکے ہوگئے جن کے دلوں کا تھا تو بار

اہل دنیا اب نہ آئیں گے ستانے کے لئے
ایک ہی مسئلہ کو پوچھیں گے نہ تجھ سے بار بار

بیاں چاہیں گے نہ تجھ سے اب صحافت کے سفیر
وقت کو ضائع کرے گی اب نہ پبلک کی پکار

کام کیا ہے اب خدا والوں کا اپنے عہد میں
خود نمائی، خود فروشی کی ہو جب دنیا شکار

تیری بیماری میں اللہ رے [illegible] تری
جست ایک ایسی لگائی ہوگیا دنیا سے پار

بن گئے تھے جس کے دل میں رحمۃ للعالمیں
گود میں اس کو نہ لے کیوں رحمت پروردگار

دل بھی کہتا ہے کہ تو مرحوم ہے، مغفور ہے
مصطفیٰ تیرے شفیع اور رب ترا آمرزگار

ہے یہی کافی کہ تجھ کو [illegible] دربار سے
جانشینی اور خلافت کا تھا حاصل افتخار

گرچہ تو تنہا گیا ہے پر دلاتا ہوں یقیں
آرہے ہیں آگے پیچھے تیرے سب احباب دیار

حق کی مرضی تھی یہی، [illegible] نہ آرزو اپنی یہ تھی
اور اعظم گڑھ میں یا دسنہ ہی میں تیرا مزار

بس مدفون [illegible] کیا اب روح تو آزاد ہے
اپنے تصنیفی ادارہ کی تماشا کر بہار

قافلہ سالار اب بھی غم زدہ مسعود ہے
بعد تیرے پشت پر اپنی اٹھائے تیرا بار

رو رہے ہیں منہ چھپائے مولوی عبدالسلام
دل بھی اور آنکھیں بھی ان کی آج ہیں خونناب بار

شاہ مولانا معین الدین احمد کو بھی دیکھ
چاک ہے جن کا گریباں اور دامن تار تار

اور عزیزِ خاص تیرا وہ صباح الدین غریب
تیرے ہی در پر پڑا ہے خستہ وزار ونزار

راہ میں آئے گا لکھنؤ اور دریاباد بھی
ہیں جہاں تھامے کلیجہ تیرے کچھ یارانِ غار

ہو کبھی دسنہ جو آنا تو رہے اس کا خیال
[illegible] ہے یاں آرزوؤں کا مزار

فخر ندوہ

استاذ وشاگرد کے اقوال

حضرت سید صاحبؒ کے استاذ علامہ شبلی نعمانیؒ نے فرمایا:

''ندوہ نے کیا کیا، کچھ نہیں کیا، ایک سلیمان کو پیدا کیا تو یہی کافی ہے''۔

(خطبہ اجلاس ندوۃ العلماء ۱۹۱۲ء)

اور حضرت سید صاحبؒ کے شاگرد رشید مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے فرمایا:

''اگر ندوہ نے علامہ سید سلیمان ندویؒ کے علاوہ کسی اور کو نہ پیدا کیا ہوتا تو یہی اس کے فخر کے لئے کافی تھا''۔

مولانا محمد علی جوہرؒ

ندوہ نے اگر اور کچھ نہیں تو ایک سید سلیمان پیدا کر دیا، اور اس پر وہ جتنا ناز کرے کم ہے، سید جمال الدین افغانی جب اتحاد اسلامی کی کوششیں کر رہے تھے اور مصر و ایران کی آزادی کو برطانیہ کی ہوس پرستیوں سے بچانا چاہتے تھے تو اس وقت انہیں اگر کسی پر اعتماد تھا تو ایک سید محمد عبدہ پر تھا، اور وہ فخریہ کہا کرتے تھے کہ اگر برطانیہ کو اگر اپنے سب سے بڑے جنگی بیڑے پر ناز ہے تو مجھے ایک شاگرد پر اس سے زیادہ فخر ہے جو ایسے کتنے جنگی بیڑے بیکار کردے گا، آج اگر علامہ شبلیؒ زندہ ہوتے تو اپنے اس شاگرد رشید پر کچھ کم ناز نہ کرتے۔

حضرت سید صاحب کے متعلق ان کے مرشد حضرت تھانویؒ کا ارشاد

از سلیماں گیر اخلاص عمل — واں تو ندوی را منزہ از دغل
اے دلت مخمور از اسرار حق — اے دلت معمور از آثار حق
اے دلت پرنور از انوار حق — اے دلت مسرور از اظہار حق

علامہ اقبالؒ کا اعتراف عظمت

علوم اسلامیہ کے جوئے شیر کا فرہاد آج سید سلیمان ندویؒ کے علاوہ اور کون ہے؟ آج سید سلیمان ندویؒ ہماری علمی زندگی کے سب سے اونچے زینہ پر ہیں، وہ عالم ہی نہیں امیر العلماء ہیں، مصنف ہی نہیں رئیس المصنفین ہیں، ان کا وجود علم وفضل کا ایک دریا ہے جس سے سیکڑوں نہریں نکلی ہیں اور ہزاروں کھیتیاں سیراب ہوئی ہیں۔

علامہ تقی الدین ہلالی مراکشیؒ

"العلامة الجامع لشتات العلوم المنطوق منها والمفهوم والمعقول والمنقول".

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

واقعہ یہ ہے کہ میں نے ہندوستان و بیرون ہند کی سیاحت اور ممالک اسلامیہ سے واقفیت کے سلسلہ میں مولانا سید سلیمان ندویؒ جیسا جامع فنون اور متنوع الذوق نہیں دیکھا۔

اردو افسانہ پر سید صاحب کا تبصرہ

ہمارے ملک میں افسانہ نویسی جس طرز کی جاری ہے، اس کے لئے نہ علم کی ضرورت ہے نہ مہارت انشاء کی، ہر وہ صاحب قلم جو دو انسانوں کی باتوں کو قید تحریر میں لانا چاہتا ہو وہ سب سے بڑا افسانہ نویس ہے، اس طرز تحریر میں نہ منطقی دلائل کی ضرورت پڑتی ہے نہ فلسفیانہ نظریوں کی، نہ تاریخی معلومات کی، نہ ادبی نکتہ دانی کی، نہ مذہبی علوم کی، بلکہ صرف اتنا سلیقہ کافی ہے کہ وہ مبتذل خیالات، سوقیانہ تصورات اور عریاں جذبات کو نامانوس ترکیبوں، اور مضحکہ انگیز فقروں میں ادا کر کے نو خیزوں کو بہکا اور نوجوانوں کو لبھا سکے...... کیا علم و دانش ک بعد ادب واخلاق بھی اس طبقہ سے رخصت ہو چکا ہے۔؟؟؟

اردو افسانہ پر سید صاحب کا تبصرہ

ہمارے ملک میں افسانہ نویسی جس طرز کی جاری ہے، اس کے لئے نہ علم کی ضرورت ہے نہ مہارت انشاء کی، ہر وہ صاحب قلم جو دو انسانوں کی باتوں کو قید تحریر میں لانا چاہتا ہو وہ سب سے بڑا افسانہ نویس ہے، اس طرز تحریر میں نہ منطقی دلائل کی ضرورت پڑتی ہے نہ فلسفیانہ نظریوں کی، نہ تاریخی معلومات کی، نہ ادبی نکتہ دانی کی، نہ مذہبی علوم کی، بلکہ صرف اتنا سلیقہ کافی ہے کہ وہ مبتذل خیالات، سوقیانہ تصورات اور عریاں جذبات کو نامانوس ترکیبوں، اور مضحکہ انگیز فقروں میں ادا کر کے نوخیزوں کو بہکا اور نوجوانوں کو لبھا سکے...... کیا علم و دانش ک بعد ادب واخلاق بھی اس طبقہ سے رخصت ہو چکا ہے۔؟؟؟

عصمت چغتائی اور کرشن چندر پر سید صاحب کا تبصرہ

ترقی پسند تحریک کے پہلے اجلاس بھوپال میں سید صاحب سے ان دونوں حضرات کے متعلق رائے دریافت کی گئی، سید صاحب نے فرمایا: دونوں بے حیائی میں دوڑ کر رہے ہیں دیکھئے کس کی جیت ہوتی ہے۔

☆☆☆

ادب برائے ادب کا تصور محض ذہنی عیاشی ہے

ادب برائے ادب کا تصور محض ذہنی عیاشی ہے، اور ادب برائے زندگی ہی حق ہے، مگر کون سی زندگی، وہ زندگی جو اسلام کا مطلوب ہو فی الدنیا و فی الآخرۃ۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ

سید صاحب کا پیغام

ترقی پسند نوجوان ادیبوں کے نام

نوجوان ادیبو! اور ہندوستان کی زبان اور قلم کے مالکو!

کبھی میں بھی نوجوان ادیب تھا، اس وقت کے بوڑھے مجھے دیکھ کر اور میری باتیں سن کر اس قسم کے اعتراضات مجھ پر بھی کرتے تھے، آخر میں بھی پرانا ہوا اور ان کی عمر کو پہونچا تو مجھے بھی اپنے نوجوانوں کے تیور کو دیکھ کر ویسا ہی تعجب آتا ہے، اب نئے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کی دنیا ہے۔

لیکن عزیزو! ایک دن تم کو بھی پرانا بننا ہوگا اور تمہارا ترقی پسند ادب بھی پرانا ہوگا، اس لئے نیا اور پرانا ہونا کوئی خاص بڑائی کی بات نہیں، نہ ہر پرانی چیز غلط اور نہ ہر نئی چیز ٹھیک ہے، اس کے غلط اور ٹھیک ہونے کی کسوٹی اس کی افادیت ہے۔

حضرت شاہ عبدالحق دہلویؒ کی انشاء پردازی

ان کی معیاری فارسی کون انکار کرسکتا ہے، فارسی کے بڑے بڑے انشا پرداز کے مقابلہ میں شیخ کا قلم پیچھے نہیں رہ سکتا۔ (نظام تعلیم وتربیت جلد دوم ص: ۳۹۰)

☆☆☆

حضرت شاہ ولی اللہ اور حضرت شاہ عبدالعزیز کا ادبی مقام

"شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز کی کتابوں کو پڑھئے اور اس زمانہ کے بڑے بڑے ارباب انشاء کی کتابوں کا مطالعہ کیجئے، مشکل ہی سے ان حضرات کی عبارات ان سے دب سکتی ہیں"۔ (تذکرہ شاہ ولی اللہ، ص ۱۹۸)

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی

حضرت شیخ شرف الدین احمد یحیٰ منیریؒ

کے مکتوبات کی ادبی معنویت

علوم ومعارف کے علاوہ یہ مکاتیب زورقلم، قوت بیان اور حسن انشاء کا بھی اعلیٰ نمونہ ہیں، اوران کے بہت سے ٹکڑے اس قابل ہیں کہ دنیا کہ بہترین ادبی نمونوں میں شامل اور ''ادب عالی''میں شمار کیئے جائیں۔

حضرت شیخ شرف الدین یحیٰ منیری اور حضرت مجدد الف ثانیؒ، شیخ احمد فاروقیؒ کے مکتوبات کا بڑا حصہ، عالمگیر کے رقعات، شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی ازالۃ الخفاء اورشاہ عبدالعزیز صاحب کی تحفۂ اثناعشریہ کے بہت سے ٹکڑے فارسی ادب وانشاء کا کامیاب نمونہ ہیں۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

لحضرة الاستاذ العلامة السيد سليمان ندوى، حفظه الله وابقاه

بمناسبة فضل الله علينا بشفائه

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله وسلام على عباده الذين اصطفى

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله وحده والصلوة والسلام على من لا نبي بعده

العقد المنير الادبی

نذرا لمولانا السید سلیمان ندوی

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

برزت تمیل بقدّ ھاتیھا فما ... أحلا سناھا لیتھا تبسما

وأتت کظبی فی الفلا متعما ... وغدت تمیس وفی بھاءٍ اعظما

وحنت بمعطفھا البدیع فابھجت ... نفسا تذوب وقلبھا متظلما

فکان ناھدۃ الصدور بدت لنا ... بحلا الجمال وحالھا متکلما

فرایت فی ثغر المھا نورا بدی ... والخال فوق خدیدھا متحکما

وبدت تشیر الی الانام بطرفھا ... وبفعلھا المشکور نعم المغنما

ذا "سید" وسلیل بیت قد حوی ... علما وفضلا رفعۃ و تنعما

"ندوی سلیمان" الوری شھم علا ... والیوم یوم مدیحہ مترنما

بدر انار بعلمہ قطرا غدا ... متخبطا لیل الجھالۃ اظلما

لا سیما ب"معارف" العلم التی ... کانت لطلاب الحقیقۃ بلسما

وبسیرۃ لمحمدٍ حل الھنا ... صلی اللّٰہ علیہ ربی سلما

و"شریف" فی حفظ الجلیل وحصنہ ... وبدیع شعری بالمعانی نظما

بقلم الضعیف: عبداللّٰہ محمد شریف المکی ۱۳۵۳

جناب والا!

آمین۔ یا رب العالمین!

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

عریضہ گذار:۔ یکے از خدام احقر محمود داؤد یوسف راندیری صدر مجلس دعوت الحق بمبئی

HAZRAT ALLAMA
SYED SULAIMAN NADVI
IN PARIS - FRANCE

خلافت ڈیلی گیشن برائے لندن ۱۹۲۰ء

पेपर वेट

وفد خلافت کا اجازت نامہ
अनुमति पत्र
वफद खिलाफत
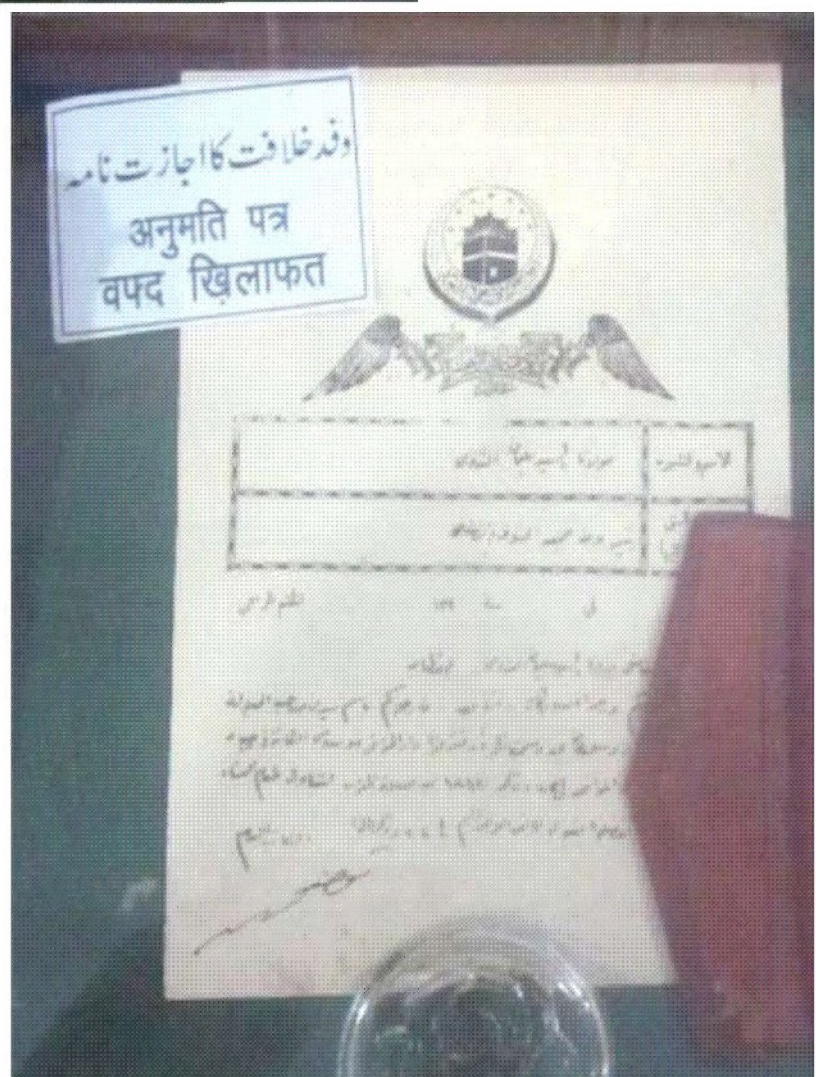
مسجد کے نیچے درخت سے متصل حضرت مولانا سید تجمل حسین دسنویؒ کی قبر
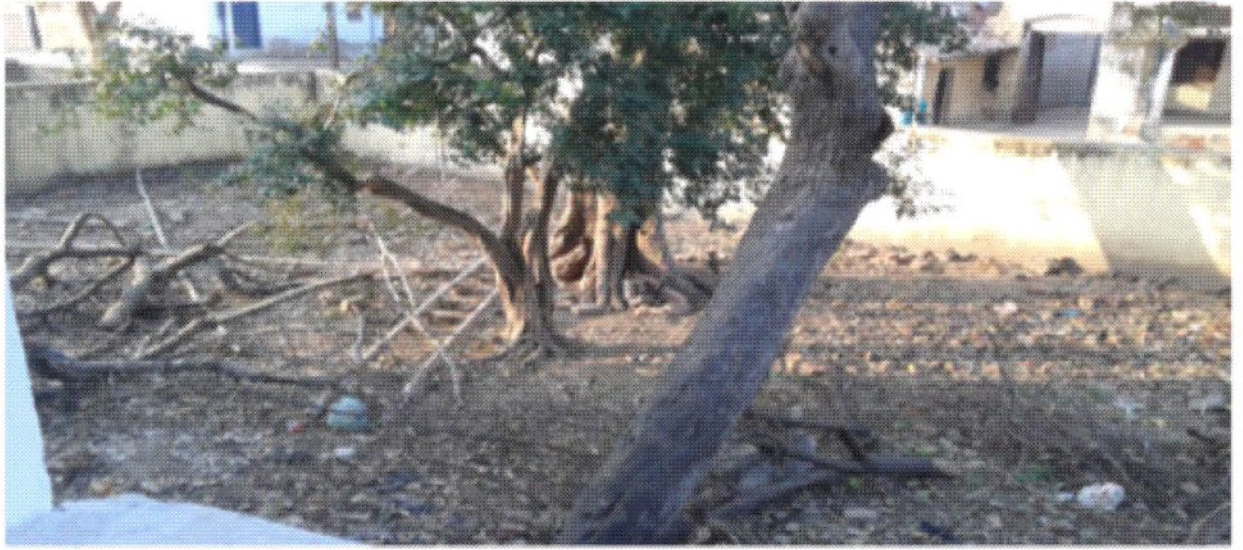
دسنہ کے مشہور کتب خانہ کی عمارت
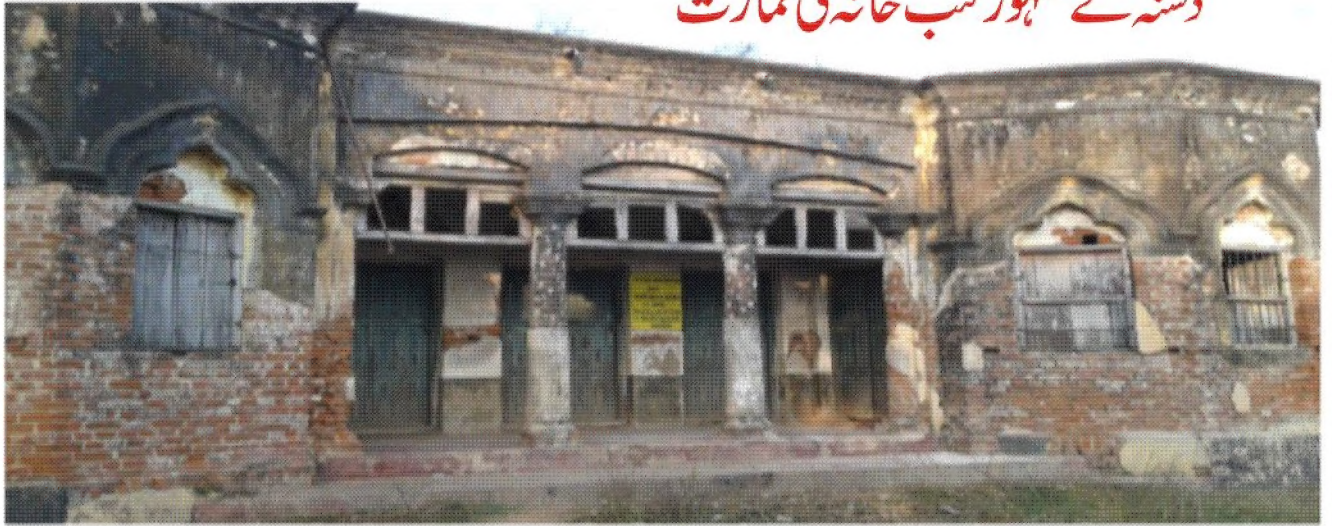
دسنہ کی مسجد کا صدر دروازہ

وہ احاطہ جہاں بزرگان دسنہ کے موروث اعلیٰ میر صدرالدین صاحب
اور ان کے اہل خانہ مدفون ہیں

مسجد کے شمالی جانب سید صاحب کا مولد جس میں آج ان کے آبائی خادموں
کا خاندان آباد ہے

مسجد دسنہ کا عقبی حصہ اور قبرستان